"پنڈت نہرو"

سیّد قاسم محمود

—

—

ادب محل، لاہور

باہتمام : اسلم انگر

ناشر ، ادب محل۔ ۷، فرینڈز کالونی۔ ملتان روڈ۔ لاہور

طابع : نقوش پریس۔ لاہور

بار اوّل: اگست ۱۹۵۹ء

عمل سرورق: تفضّل ضیاء

کتابت : محمد اقبال عبّاسی ، لاہور

قیمت : تین روپے

سعادت حسن منٹو کے نام

آج کا سورج نکلے کافی دیر ہو گئی تھی۔ لیکن پنڈت نہرو آنکھیں بند کئے ابھی تک اپنی ٹوٹی ہوئی چارپائی میں دھنسا ہوا، رعشہ زدہ ہاتھ سے تسبیح پھیر رہا تھا اور ایک ایک منکے پر اپنے مرشد کی نصیحت کے مطابق کلمۂ طیّب کا ورد کر رہا تھا۔ سورج کی دہکتی ہوئی ترچھی شعاعیں جھونپڑی کے کھلے دروازے سے داخل ہو کر براہِ راست اُس کی آدھی آدھی پنڈلیوں پر پڑ رہی تھیں۔

اُس کی سب سے چھوٹی بہو ایک موٹی روٹی کی دو تہوں کے بیچ میں لہسن کی لال لال چٹنی رکھے جھونپڑی میں آئی اور بڑبڑاتے ہوئے پنڈت نہرو کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ پنڈت نہرو نے آنکھیں کھول دیں "کیا بات ہے؟" بہو نے جواب تو کچھ نہ دیا۔ لیکن روٹی اس کے ہاتھ میں کچھ ایسی بے تعلقی سے تھما دی کہ پنڈت نہرو نے دوبارہ اپنی آنکھیں میچ لیں۔ جیسے یہ کہہ دیا ہو "مجھے کم از کم بھکاری تو نہ سمجھو۔" تسبیح کے

کئی دا سنے ایک ہی کلمے کے ورد میں لاکر اُس نے دل ہی دل میں دُعا مانگی "خُدایا! اب تو مجھے موت دے دے۔" بہو واپس چلنے لگی تو اُس نے پوپلے مُنہ سے ایک ایک لفظ الگ الگ پھسلاتے ہوئے کہا "بہو! تُو نے روٹی تو دے دی، مگر پانی نہیں دیا۔ کل بھی نہیں دیا تھا۔ پرسوں بھی نہیں دیا تھا۔"

بہو نے وہیں دروازے میں کھڑے کہا "پانی ابھی اور کئی دن نہیں ملے گا۔"

پنڈت نہرو نے کہا "کیا کہہ رہی ہے؟ سُنائی نہیں دیتا۔"

بہو قریب آئی اور جھک کر اُس کے کان میں چیخ کر کہا "کنوئیں میں کتا گر گیا ہے۔"

پنڈت نہرو نے اپنی گڑھوں میں دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں پتلیوں سمیت پھیر کر پوچھا "کیا ہوا؟"

"کنوئیں میں کتا گر گیا ہے۔"

"کتا گر گیا ہے؟"

"ہاں۔"

"کہاں؟"

"کنوئیں میں۔"

"انا للہ وانا الیہ راجعون" پنڈت نہرو نے کئی بار دُہرایا۔ اُس کی بہو پیچکے سے باہر چلی گئی۔

یہ کنوآں موضع رتہ کھنہ کی پختہ عمارتوں سے کوئی پچاس گز ہٹ کر بنا ہُوا ہے۔ موضع رتہ کھنہ ضلع منٹگمری میں بہاول پور اور بھارت کی سرحد پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ دس دس میل کے رقبے میں یہ گاؤں اس وجہ سے مشہور ہے کہ یہاں ایک کنوآں ہے۔ یہ کنوآں تین تین چار چار میل کے پانچ سات دیہات کو پینے کا پانی مہیا کرتا ہے۔ گزشتہ سال جُون میں جب بھارت نے نہر دیپال پور کا پانی بند کر دیا تو زمینیں تو خیر خشک ہوئیں سو ہوئیں، انسانوں کے علاوہ مویشیوں اور پرندوں کا بھی سارا دار و مدار اسی کنوئیں پر محدود ہو کر رہ گیا۔ آخری چند ماہ میں تو، یعنی جب سے گرمیاں شروع ہُوئی تھیں۔ یہ حالت ہو گئی تھی کہ دیہات کی عورتیں صبح سے شام تک مٹکوں پہ ہاتھ رکھے قطار میں بیٹھی رہتی تھیں اور اُن کی باری نہ آتی تھی۔ ساری ساری رات بیٹھنے کے بعد

اگلے دن دو چار مشکے اور بالٹیاں بھرنے کا موقع آتا تھا۔ کنوئیں کے چاروں طرف سے بیک وقت بیس بیس بالٹیوں کو نیچے پھینکنے، پانی میں ڈبکیاں لگانے اور اُوپر کھینچنے کی مختلف آوازیں آتی رہتی تھیں۔ چند بے روزگار مشٹنڈوں کو مُفت میں ایک روزگار میسّر آگیا تھا اور وہ قدرت کے سب سے مُفت عطیے کی بھی چور بازاری کرنے لگے تھے۔ عورتوں، بچّوں اور بوڑھوں کو پیچھے دھکیل کر وہ دھم سے بالٹی نیچے پھینکتے تھے اور گھرے کنوئیں سے پانی باہر نکال کر وہ کھاتے پیتے گھرانے کو ایک مٹکا فی روپیہ کے حساب سے فروخت کر دیتے تھے۔ انسانوں کو تو خیر آدھ پون گلاس مل ہی رہا تھا۔ ویسے بھی انسان پانی پیتا ہی کتنا ہے! لیکن تھنوں سوکھی گائیں اور بھینسیں اور بھالی بیل خشک کھیتوں میں سوکھے سوکھے ڈنٹھلوں میں مُنہ مارتے مارتے اچانک ڈکرانے لگتے تھے اور دیر تک خوفناک آوازیں نکالتے رہتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس علاقے پر کوئی عذاب آیا ہُوا ہے یا ابھی آنے والا ہے۔ ہر کنوئیں کے ارد گرد جو چوبچے بن جایا کرتے ہیں وہ اس کنوئیں پر پیدا ہی نہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ تھوڑا بہُت پانی جو نالیوں میں ٹھہر جاتا تھا، جنگلی کبوتروں، فاختاؤں، کووں اور چڑیوں کے کام آجاتا تھا۔ پانی پینے والو

کی بے صبری دیکھ کر بعض اوقات سطح زمین کے نیچے کا سمندر غصّے میں آجاتا اور مچلتی ہوئی تیز و تند موجوں کی طنابیں کھینچ لیتا اور کنوئیں میں کیچڑ ہی کیچڑ رہ جاتی۔

پنڈت نہرو کے گھرانے کی وہ عورتیں، جو پردہ نہیں کرتی تھیں، پرسوں صبح کچھ پانی بھر کر لائی تھیں، جس میں سے آدھا اُن کے مردوں نے اپنی بھینسوں اور بیلوں کو پلا دیا تھا اور باقی آدھا گھر میں خرچ ہو گیا تھا۔ کل صبح ایک مٹکے میں اتنا پانی موجود تھا کہ پنڈت نہرو کو روٹی کے ساتھ دیا جا سکتا تھا۔ لیکن اُس کی بہوئیں اب اپنے بڈھے خسر کو بار سمجھنے لگی تھیں۔ اور آج تو واقعی پانی کی ایک بوند بھی موجود نہ تھی کیونکہ کل ایک پیاسا کتا اوپر کی بالٹیوں میں پانی ڈھونڈتا ڈھونڈتا نیچے گر گیا تھا۔

پنڈت نہرو نے سر کے نیچے سے اپنا میلا کچیلا، پھٹا پرانا کھدر کا کرتا نکالا جو پچھلی عید پر اُس کے ایک پوتے نے بنوا دیا تھا۔ کافی دیر تک اس کا منحنی جسم مڑ تڑ کر کرتا پہننے کی کش مکش کرتا رہا۔ پھر وہ بڑے اضطراب سے اُٹھا اور جھونپڑی کے مختلف گوشوں میں اپنی لاٹھی ٹٹولنے لگا۔ تین ماہ سے وہ چارپائی سے جدا نہ ہوا تھا۔ لاٹھی کا سہارا لیئے اُسے پورے تین ماہ

ہو گئے تھے۔ لاٹھی نہ ملی تو وہ نیا نیا لاوا جو دوروز سے پانی نہ ملنے کی وجہ سے بڑھاپے کی سوکھی ہوئی رگوں میں کھول رہا تھا، اُس کے دماغ میں سمٹ آیا۔ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ نظر پہلے ہی جواب دے چکی تھی۔ چارپائی کے پائے سے ٹھوکر کھا کر اوندھے مُنہ گر پڑا۔ دُبلے پتلے بے جان مریل ہاتھ دیر تک اُسے سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے۔ سوکھی ہوئی ٹانگیں فرش پر تڑپتی رہیں، لیکن وہ اُٹھنے بھی نہ پاتا تھا کہ پھر گر پڑتا تھا۔ ایک گٹھڑی بندھی ہوئی سی پڑی تھی۔ ہاتھ پاؤں اور سارا جسم اپنی پوری طاقت سے اس گٹھڑی کو اُٹھا رہا تھا۔ لیکن یہ گٹھڑی ہوتی تو اُٹھتی، یہ تو ایک صدی تھی جو فرشِ زمین پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تڑپ رہی تھی۔ آج یہ صدی اُس المناک لمحے پہ آکر ٹھہر گئی تھی۔ جب زمانے کی چکی اُلٹی چلنے لگی تھی، جہاں صدیوں کو اُٹھنا نہ آتا تھا، گرنا آتا تھا۔

سو سال پہلے . . . .

دس جولائی اٹھارہ سو ستاون کی رات کو پچاس گوروں کا ایک مسلّح رسالہ گھوڑوں پہ سوار روہتک سے دہلی کی طرف جاتا ہوا شریف آباد کے پہلو سے گزر رہا تھا۔ ان کا سرکاری راشن ختم ہو چکا تھا۔ بھوک پیاس نے

کچھ شدت دکھائی تو اُنھوں نے گاؤں والوں سے حکماً کہا: ہمیں روٹی اور
پانی دو، مرغیاں اور انڈے کھلاؤ، ورنہ گولی سے اُڑا دیں گے۔ گاؤں
والوں نے پہلے ہی فیصلہ کر رکھا تھا کہ بچّہ بچّہ کٹ مرے گا لیکن انگریزوں
کی اطاعت قبول نہ کرے گا۔ اس وقت گاؤں میں لے دے کر پچاس مرد
ہوں گے جو عورتوں اور بچّوں کی حفاظت کے لئے یہاں رہ گئے تھے۔
باقی آٹھ نو سو لوگ دو ماہ سے دہلی میں پڑے تھے اور بہادر شاہ ظفر کو
سلطنتِ ہند کا تاجدار برقرار رکھنے کے لئے تن من کی بازی لگائے
بیٹھے تھے جب گاؤں والوں نے ہر طرح کی اعانت سے صاف انکار
کر دیا تو گوروں نے حکم دیا کہ سارا گاؤں باہر کھلے میدان میں آجائے۔
اس حکم پر لوگوں میں افراتفری مچ گئی۔ عورتیں اور بچّے ایک بڑے سے
پختہ مکان میں جمع ہو گئے اور مرد اوپر چوبارے میں اینٹیں لے کر بیٹھ
گئے۔ گورے بھری ہوئی رائفلوں کے ساتھ گھوڑوں پر چڑھے گاؤں
کی پتلی پتلی، اندھیری گلیوں میں دیر تک گھومتے رہے۔ لیکن اُنھیں کہیں سے
آدم زادوں کی خوشبو نہ آئی۔ پختہ مکان کے آگے سے گزرتے ہوئے
ایک گورے نے یُونہی ہوا میں فائر کرنے شروع کر دیئے۔ پیش امام

سید شہاب الدین اپنے آپ پر قابو نہ پا سکے اور گوروں پر پتھر برسانے لگے۔ پھر تو گوروں نے آن کی آن میں دروازہ توڑ دیا اور ایک ایک عورت اور بچے کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اتفاق سے شہاب الدین کے ہاتھ میں خاندانی تلوار تھی، اُس نے دالان کے بیچ میں گڑے ہوئے موٹے ستون کی اوٹ میں کھڑے کھڑے، اندھیرے سے فائدہ اُٹھا کر تین گوروں کی گردنیں صاف اُڑا دیں۔ ٹارچ کی روشنی کسی نئے شکار کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے دالان تک پہنچ گئی اور شہاب الدین کا چہرہ نمایاں کر گئی۔ اگلے ہی لمحہ شہاب الدین کی لاش صحن میں کھینچی جا رہی تھی۔

پچھلے وقتوں میں اورنگ زیب عالمگیر ایک دفعہ اس علاقے سے گزر رہا تھا کہ راستے میں مجبوراً پڑاؤ ڈالنا پڑا۔ ایک شخص مرزا شریف بیگ نامی نے بادشاہ اور اُس کے مصاحبین کی اتنی خدمت کی تھی کہ بادشاہ سلامت نے چلتے ہوئے پوری جاگیر مرزا شریف بیگ کو عطا کر دی تھی۔ اُسی کے نام پر یہ گاؤں شریف آباد بس گیا تھا جو اب بگڑ کر شریفہ آباد ہو گیا تھا۔ اُس نے اس جگہ پر جہاں اورنگ زیب نے نماز پڑھی تھی، ایک مسجد تعمیر کرائی تھی جس کا نام "عالمگیر مسجد" رکھا گیا۔ درمیانی

محراب پر ۱۰۴۷ھ تک سالِ تعمیر "۱۱۲۵ھ بمطابق ۱۷۰۵ء" نیلے پیلے رنگوں میں لکھا ہوا تھا۔ اس مسجد کا پہلا پیش امام سیّد غیاث الدّین مقرّر ہوا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اورنگ زیب کو عشاء کی نماز پڑھائی تھی۔ اور یہی غیاث الدّین شہاب الدین کا پڑدادا تھا جسے امامت کے ساتھ وہ تلوار بھی ورثے میں ملی تھی جو کہتے ہیں، ہمایوں نے ایران جاتے وقت اُن کے جدِّ امجد کو بطور انعام دی تھی اور جس سے شہاب الدّین نے تین گوروں کی گردنیں اُڑا دی تھیں۔

شہاب الدین پیش امام کی حاملہ بیوی اس ہنگامے سے بچ بچا کر کھیتوں میں ہوتی ہوئی قبرستان کے عقب میں جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ اُس رات بادل گرج رہے تھے اور بجلیاں جلدی جلدی چمک رہی تھیں۔ ایک بار ایک بجلی زور سے کڑکی اور اُس عورت کے پاس والی جھاڑی چاٹ کر چلی گئی۔ عورت بے ہوش ہوگئی۔ دوسرے دن جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے پہلو میں ایک گوشت پوست کا لوتھڑا گٹھڑی بنا بڑی بے بسی سے ننھّے ننھّے ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے۔ اُس نے لپک کر اُسے چھاتی سے چمٹا لیا۔ ماں کا گرم گرم دُودھ جوش کھاتا ہوا بچّے کے

پوپلے مُنہ میں آیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور وہ ایک صدی کا بوجھ اپنے بوڑھے کندھوں پر لادے اُٹھ بیٹھا۔ وہ اٹھارہ سو ستاون کی دس جولائی تھی اور یہ اُنیس سو ستاون کی دس مئی تھی۔ صدی کے پُورا ہونے میں صرف دو ماہ باقی تھے۔

جھکی ہُوئی کمر پہ دونوں ہاتھ رکھ کر وہ جھونپڑی سے باہر ہی کھڑا ہو گیا۔ اور کسی آتے جاتے کا انتظار کرنے لگا جو اُس کی لاٹھی تلاش کر دے۔ گاؤں کا ڈاکیہ جس کے ذمہ ارد گرد کے چھ موضعات کی ڈاک تھی، اپنی چھکڑا سائیکل پر چڑھا آیا اور پنڈت نہرو کے قریب آ کر اُتر گیا۔ سائیکل سُوکھی ہُوئی بیری کی جڑ کے ساتھ کھڑا کر کے اور خاکی پگڑی کے پلو سے چہرے اور گردن کا پسینہ خشک کر کے وہ قریب آیا اور کہنے لگا۔

"پنڈت جی، السلام علیکم۔"

پنڈت نہرو نے اپنی آنکھیں اوپر اُٹھا کر پُوچھا "کون ہے ؟"

ڈاکیے نے جواب دیا "میں تھا جی اللہ بخش۔"

"اچھا اچھا، کیا حال ہے کریم اللہ۔"

"میں اللہ بخش ڈاکیہ ہوں پنڈت جی۔" اُس نے ایک سفید لفافہ

اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

پنڈت نہرو نے کہا: "کس کا خط ہے؟ ذرا پڑھ کر سنا دے۔"

ڈاکیے نے خط کھولا تو وہ انگریزی میں لکھا ہوا تھا اور پیشانی پر نیلے رنگ کی ایک چھوٹی سی مہر منقش تھی۔ اس نے بہرے پنڈت کو چیخ چیخ کر سمجھایا: "خط انگریزی میں ہے۔ میں ابھی پٹواری کو بُلاتا ہوں۔" پھر وہ پیدل ہی گاؤں میں چلا گیا اور چند منٹوں کے بعد میٹرک پاس پٹواری کو ساتھ لے کر واپس آیا۔ پٹواری نے خط کا مفہوم مختصر لفظوں میں پنڈت نہرو کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"لکھا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے نام آپ کی چٹھی موصول ہو گئی ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ وہ خط پر مناسب کارروائی کر رہے ہیں۔ فرصت کے وقت وہ خود بھی جواب لکھیں گے۔ آپ کو سلام کہتے ہیں۔ پنڈت جی! خط پرائیویٹ سیکریٹری کی طرف سے آیا ہے۔"

پنڈت نہرو نے پٹواری سے ایک ایک جملے کی تکرار کرائی تو خط کا مفہوم اُس کے پلے پڑا۔ پٹواری اور ڈاکیہ اپنے اپنے کام پر چلے گئے۔

'پنڈت نہرو'

آج پنڈت نہرو کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ اُس نے ایسی تذلیل زندگی بھر محسوس نہ کی تھی۔ یہی پٹواری اور ٹھاکیہ بڑھ بڑھ کر باتیں بنایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ پنڈت نہرو مجذوب ہو گیا ہے۔ خواہ مخواہ جواہر لال اور گاندھی جی سے اپنے ذاتی مراسم کی بڑ ہانکتا ہے۔

تین ماہ قبل سردیوں کی ایک رات کو سب مزارع طویلہ میں بیٹھے ہوئے حقہ گڑگڑا رہے تھے اور اپنے آج کے مسائل کی گتھیاں سلجھا رہے تھے۔ شمشیر کی جھوٹی بیاسی مرگئی۔ بختیاور کا رہٹ ٹوٹ گیا۔ سنا ہے، کہ پاک پٹن والا راجباہا بھی سوکھ گیا۔ بارش اب کے بھی نہیں ہوئی۔ جانوروں کے لیئے چارہ پٹھا نہیں۔ کیا ہوگا؟ کہاں جائیں گے؟ پنڈت نہرو بھی عشا کی نماز اور مرشد کے بتلائے ہوئے وظیفے سے فارغ ہو کر اُن کے پاس آ بیٹھا۔ بختیاور ہمیشہ پنڈت کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ اُس نے لاٹھی چھین کر ایک طرف پھینک دی اور اسے گود میں اُٹھا کر پہلے اُچھالا، پھر پڑھے پر بٹھا دیا اور سارے لوگ قہقہے لگانے لگے۔ شمشیر نے حقّہ کی نے پنڈت نہرو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "پنڈت جی! اب سناؤ کیا حال ہے تمہارا۔ یہ فصل بھی خالی چلی گئی۔"

اُن دنوں پنڈت نہرو اتنا بہرہ نہیں ہوا تھا۔ لوگوں کی باتیں کان کی لو پہ اُنگلی رکھ کر آسانی سے سُن لیا کرتا تھا اور اُس کی آنکھوں میں بھی اتنی روشنی باقی تھی کہ آدمی کا چہرہ جلدی ہی پہچان لیا کرتا تھا۔ کہنے لگا "شمشیر علی! خدا تعالیٰ کو منظور ہوا تو صبح پنڈت نہرو کے نام ایک خط لکھوں گا۔ اُس کے میرے چالیس سال کے تعلقات ہیں۔ ہم دونوں سن اکیس میں اکٹھے جیل گئے تھے۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔"

اُس کا پڑپوتا جمال الدین غصے میں بپھر گیا" تمھیں تو ساری عمر اُس نہرو کے گُن گاتے گزر گئی۔ سن اکیس میں اکٹھے جیل گئے تھے اور سن سینتیس میں میں نے اُس کی دعوت کی تھی اور سن بیالیس میں ہم نے ریل کی پٹڑی اکھاڑی تھی۔ ایسی باتیں سنتے سنتے ہمارے تو کان پک گئے۔"

پنڈت نہرو نے تحمل سے کہا" میاں بھائی، صبح تیرے سامنے ہی خط لکھوں گا۔"

جمال الدین بولا "خط لکھنے کا کیا ہے، وہ تو میں بھی لکھ سکتا ہوں۔ ہر نتھو خیرا لکھ سکتا ہے۔ جواب کون دے گا۔"

پنڈت نہرو اعتماد سے بولا "اس کی مجال نہیں ہے کہ میرے خط کا

جواب نہ دے۔ اُس کا باپ بھی دے گا۔ اور اگر جواب نہ آیا تو میں دہلی جاکر اُس کی مرمت کروں گا۔ پتا ہے، وہ مجھے چاچا چاچا کہتا ہے چاچا۔"

پٹواری نے کہا: "اچھا، اگر وہ جواب نہ دے تو تمھاری کیا سزا؟"

کہنے لگا: "جو چور کی سزا سو میری۔ یہ ڈاڑھی مونچھ منڈوالوں گا، اور جو کہوگے کروں گا۔ مُنہ کالا کرکے رنہ کھتہ سے نکل جاؤں گا، یا زہر کھالوں گا۔"

ڈاکیہ نے اپنی جیب سے فاؤنٹن پن اور کاغذ نکال کر کہا: "لو، پنڈت جی، پھر ابھی لکھ ڈالو۔ صبح آئے کہ نہ آئے۔"

جمال الدین کا لڑکا کمالو ٹوکے پر سے ایک پٹڑا اُٹھا لایا اور پنڈت نہرو نے اُس پر کاغذ رکھ کر جواہر لال نہرو کے نام خط لکھنا شروع کیا: "از موضع رنہ کھتہ۔ ۱۸ر فروری ۱۹۵۷؁ء" اتنا لکھ کر اُس نے پٹواری سے کہا: "منشی جی، مجھ سے نہیں لکھا جاتا۔ ہاتھ کانپتا ہے۔ میرا خط بھی بڑا شکستہ ہے۔ میں بولتا ہوں۔ تُو لکھتا چل۔"

اب پٹواری نے لکھنا اور پنڈت نہرو نے لکھوانا شروع کیا:-

"پنڈت جی! میری طرف سے پرنام ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم ابھی تک، اپنے چاچا رسلال الدین کو نہ بھولے ہوگے۔ گاندھی جی کے انتقال پُرملال پر میں نے ایک عریضہ تمہارے نام لکھا تھا اور تم نے جواب بھی دیا تھا اور میری خیریت پوچھی تھی۔ مجھے دلی قلق ہے کہ میں اُس خط کا جواب نہ دے سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ جسم پر ہر وقت رعشہ سا طاری رہتا ہے۔ لکھتے ہوئے ہاتھ تھر تھر کانپتا ہے۔ اور اس موضع میں ایسا کوئی پڑھا لکھا آدمی ہے نہیں جس سے خط لکھواؤں۔ بس ایک پٹواری ہے، سو وہ یہی نہیں مانتا کہ تمہارے میرے دیرینہ تعلقات ہیں..."

پٹواری نے یہ فقرہ لکھنے سے پہلے قلم اُٹھا کر قہقہہ لگایا "میں تو مانتا ہوں چاچا۔"

پنڈت نہرو نے اُس کا قلم والا ہاتھ پکڑ کر کاغذ کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "تو لکھتا جا، بیچ میں نہ بول۔ ہاں لکھ۔"

"اب میں تمہارے پچھلے خط کا جواب دے رہا ہوں۔ تمھیں یاد ہوگا کہ تم سے آخری ملاقات ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کونسل چیمبر میں ہوئی

تھی۔ تم سے بچھڑ کر میں تین ماہ بعد پیدل قافلے کے ساتھ معہ بچوں کے
پاکستان آ گیا تھا، اور ضلع منٹگمری کے اس گاؤں رتہ کھتہ میں آباد
ہو گیا تھا جو اُس وقت خالی پڑا تھا۔ پہلے یہاں سکھ رہتے تھے۔
اللہ کی مہربانی سے ہمیں زمینیں الاٹ ہو گئی تھیں اور کسی نہ کسی طرح
ہمارا گزارہ ہو رہا تھا۔ لیکن پچھلے سال سے زمینیں خشک پڑی ہیں
اور خریف اور ربیع کی دونوں فصلیں تباہ ہو چکی ہیں۔ ہم وہ خوراک
کھا رہے ہیں جو کبھی اپنے جانوروں کو ڈالا کرتے تھے اور ہمارے
جانور بھوکے پیاسے پھر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پورے
علاقے میں کنوئیں بہت کم ہیں۔ پانچ پانچ کوس پر جا کر ایک آدھ
کنوئیں کی شکل نظر آتی ہے۔ ساری زمینیں نہر دیپال پور کے پانی
سے سیراب ہوتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں اور اخباروں میں روز آتا ہے
کہ اس نہر کا پانی تمہارے حکم سے بند ہوا ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا
میں کہتا ہوں کہ پنڈت جی کو تو اس کا علم بھی نہ ہوگا۔ بات اصل میں یہ ہے
پنڈت جی! کہ تم نے مہاسبھائیوں کو اپنی حکومت میں شامل کر کے
بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میں ہندوستان میں ہوتا تو کبھی ایسا نہ کرنے

دینا۔

بہرحال اب تم خاص الخاص توجّہ دے کر فوراً نہر وبیال پور کا پانی کھلوا دو، ورنہ تمہارا چاچا جینے جی مر جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم اس خط کو تار سمجھو گے اور فوراً پانی کھلوا دو گے۔ یہاں بارش بھی بالکل نہیں ہوتی۔ باقی سب خیریت ہے۔ ماضی کی یادوں کے سہارے زندگی کے باقی ماندہ ایام پورے کر رہا ہوں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو میری طرف سے سلام کہنا اور کہنا کہ مولوی جلال الدین جو تم سے آصف علی کے مکان پر خوب جھگڑا تھا، وہ تمہیں سلام کہتا ہے۔ خط کا جواب ضرور بالضرور اور جلد از جلد دینا۔ شدید انتظار رہے گا۔ فقط

تمہارا چاچا

مولوی جلال الدین"

خط لکھنے کے دوران پٹواری دل ہی دل میں گنگنا رہا تھا۔ لوگ چپکے چپکے ہنستے رہے تھے اور سرگوشی کے انداز میں، استہزائیہ رنگ میں باتیں کرتے رہے تھے اور ایک دوسرے سے کہتے رہے تھے کہ پنڈت جی کا تو دماغ چل گیا ہے

بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہے۔ جب لفافے پر پتا لکھنے کی اُلجھن پیش آئی تو اسے بھی پنڈت نہرو ہی نے رفع کیا۔ اس نے لکھوایا۔ "بخدمت شریف جناب پنڈت جواہر لال نہرو دام ظلکم۔ وزیر اعظم ہند و پاکستان۔ دہلی۔" پھر کونے میں لکھوایا تھا۔ "از طرف مولوی جلال الدین۔ موضع رننہ کھنہ۔"

پٹواری نے ڈاکیے کو لفافہ تھماتے وقت پنڈت نہرو کی آنکھ بچا کر صرف 'ہند' باقی رہنے دیا۔ ڈاکیے نے دوسرے دن وہ خط سُپردِ ڈاک کر دیا تھا اور پنڈت نہرو نے اپنے آپ کو سپردِ الٰہی کر دیا تھا۔ یہ اُس کی آن کا سوال تھا۔ خط گاؤں کے معززین کے بیچ بیٹھ کر لکھا گیا تھا۔ اگر جواب نہ آیا تو اُس کا سارا بھرم بُلبلے کی طرح ٹوٹ جائے گا۔ اُس نے پوتوں اور پڑپوتوں کو مجبور کیا تھا کہ وہ فوراً اُس کے لئے ایک علیحدہ جھونپڑی بنا دیں۔ جھونپڑی ایک ہی دن میں بنا دی گئی۔ جب وہ جھونپڑی میں منتقل ہوا تو اُس کے پاس فقط تین چیزیں تھیں۔ یہ جیبی قرآن مجید، شیشم کی ٹیڑھی میڑھی لاٹھی اور ایک تھیلی جس میں اُس کے نام بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے خطوط تھے۔ یہی تین چیزیں اُس کی کُل کائنات تھی جسے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے سے جُدا نہ کرتا تھا۔ ہر وقت یہ تینوں چیزیں

اپنے پاس رکھتا تھا۔ جھونپڑی میں ایک کھٹیا اُس کے لئے ڈال دی گئی تھی۔ لاٹھی اُس نے جھونپڑی کے ایک گوشے میں رکھ دی۔ قرآن مجید سرہانے رکھ لیا اور تھیلی جھونپڑی کے چھپر میں لٹکا دی۔ وہ مسلسل تین ماہ اس کھٹیا پر بے حس و بے جان پڑا رہا۔ خط کا جواب منگوانے کے لئے اس نے پوری روحانی طاقت صرف کر دی۔ دن رات اپنے پیر و مرشد خواجہ حسن نظامی کو آوازیں دیتا رہتا "یا خواجہ! میرا بھی بیڑا پار لگا دے۔" نماز وہ لیٹے لیٹے اشاروں سے پڑھنے لگا۔ دُعا مانگنے کے بعد وہ مُرشد کا بتایا ہُوا کلمۂ طیب کا ورد کرتا۔ پھر اپنے خواجہ سے کہتا۔ "بے شک نہر نہ کھلوا، مگر خط کا جواب ضرور دلوا دے۔"

وہ لوگ جنھوں نے اُسے سیاسی کاموں میں شد و مد سے حصّہ لیتے اور بار بار گرفتار ہونے اور رہا ہوتے دیکھا تھا، دُنیا سے اُٹھ چکے تھے نئی نسل کو وہ اپنے قصّے سناتا تو وہ اعتبار نہ کرتی بلکہ اُلٹا اُس کا مذاق اُڑاتی۔ اُس میں ظرافت کا مادہ تھا نہیں کہ نئی نسل کا ساتھ دے سکتا۔ یا نئی نسل اُس کا ساتھ دے سکتی۔ اُس کی ساری زندگی ایسے ایسے مرحلوں سے گزُری تھی کہ وہ مجسّم سنجیدگی بن گیا تھا۔ جواہر لال نہرو کے ہاتھ

کا لکھا ہُوا خط اس کے قصّے کہانیوں کو سچا ثابت کر سکتا تھا۔ یوں تو اس نے لوگوں کو، پٹواری اور ڈاکیے کو، ذیلدار اور نمبردار کو، حتیٰ کہ نائب تحصیلدار کو بھی تھیلی میں بھرے ہوئے چوالیس خطوط دکھلائے تھے لیکن سب اُنھیں جعلی سمجھتے تھے۔ جواہر لال سے اپنے اس خط کا جواب منگوانے کے لئے اُس نے اپنے تصوّف، مذہب اور اپنی سو برس کی زندگی کی تمام قربانیوں اور نیکیوں کا خوب ہی سہارا ڈھونڈا۔ وہ تین ماہ کے اس مختصر سے عرصے میں اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ گزشتہ ساڑھے ننانوے برس میں بھی نہ ہُوا تھا۔ آنکھیں، جو اب ہمیشہ بند رہتی تھیں، بصارت سے خالی ہو گئیں۔ سماعت نے جواب دے دیا۔ دماغ نے سوچنا چھوڑ دیا۔ گھٹنے ٹوٹ گئے۔ کمر جھُک گئی۔ بھویں اور پلکیں سفید ہو گئیں۔ بدنما جھریوں نے جلد پر ہلّہ بول دیا۔ ہاتھ پاؤں ہلانا جُلانا دُشوار ہو گیا۔ گوشت سوکھ گیا۔ ہڈیاں نکل آئیں۔ اُس کی زندگی کا رس یُوں نچڑ گیا تھا جیسے کسی نے دھلا ہُوا کپڑا نچوڑ کر پتھر پہ رکھ دیا ہو۔ جواہر لال نہرو کا آنے والا خط اُس کی موجودہ زندگی کے جواز کے لئے کافی تھا۔

مگر خط آیا بھی تو پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے، اور وہ بھی اس

وعدۂ فردا کے ساتھ کہ "فرصت کے وقت وہ خود بھی جواب لکھیں گے"
آج پنڈت نہرو کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ آج وہ جیتے جی مر گیا تھا۔ وہ بڑھاپے
سے خوف نہ کھاتا تھا۔ بڑھاپا تو اس پر اسی دن سے سوار تھا جس دن
وہ جھاڑیوں میں پیدا ہوا تھا۔ بچپن کی شرارتوں کا مزہ اور جوانی کی شوخیوں
کی لذّت اس نے چکھی ہی نہ تھی۔ سو برس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ
ہندوستان کے چالیس کروڑ باشندوں کی طرح اس نے بھی بڑھاپے
کی سنجیدگی اور تحمّل میں گزار دیا تھا۔ عدم تشدّد اس کی عادت ہو چکی تھی۔
حالانکہ جہاد اس کے خون میں شامل تھا۔ تشدّد اس کی فطرت تھا۔ انتقام
کا جذبہ لمحہ پیدائش کے ساتھ اس کی روح پر طاری تھا۔ لیکن ساری عمر وہ
کسی سے انتقام لے سکا تھا نہ کسی پر تشدّد کر سکا تھا۔ اس کی شخصیت
کا خمیر فقط دو ہی چیزوں سے اٹھا تھا، تشدّد اور انتقام۔ اس کا المیہ
یہی تھا کہ وہ ساری عمر فقط انہی دو چیزوں کا استعمال نہ کر سکا تھا۔ عمر کا
نصف اوّل اس نے انگریز آقاؤں کی خدمت میں گزار دیا اور نصف ثانی
کانگریس کی عدم تشدّد کی مصلحت آمیز پالیسی کی اطاعت میں۔ جواہر لال
نہرو کے ہاتھ کا لکھا ہوا جواب نہ پا کر ایک صدی کا بھنچا ہوا جذبہ تشدد لمحے

کی ایک جنبش کے ساتھ اُس کے دماغ میں بجلی کی طرح کوندا اور اُس نے چاہا کہ یہ جھونپڑی اکھاڑ پھینکے، رتنہ کھنہ کی پختہ عمارتوں کو تہس نہس کر دے۔ پاکستان کا قلع قمع کر دے، ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دے ساری دُنیا کو تباہ کر دے۔ بستیوں کو آگ لگا دے اور انسانوں کی گردنیں پکڑ پکڑ کر آگ میں جھونک دے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی سی بے نُور آنکھیں غصّے کی آگ میں جلنے لگیں۔ دماغ میں چنے سے بُھننے لگے چہرے کی جھریوں کی جھیل میں جوار بھاٹا آیا اور اُس نے جواہر لال نہرو کا خط مٹھی میں مروڑ کر من ہی من میں کہا "کیا زمانہ آگیا ہے۔ جسے میں دُنیا کا سب سے شریف النّفس آدمی سمجھتا تھا، جس کی خاطر میں نے اولاد کو چھوڑ دیا جس کے کارن اپنا نام بدلوا لیا، جس کے باپ کو بچانے کے لئے پولیس کی لاٹھیاں اپنے سینے پر کھائیں، جس نے ہمیشہ مجھے چاچا کہا آج اُسے اتنی بھی فرصت نہیں کہ دو لفظی خط لکھ سکے۔ لعنت ہے مجھ پر اور لعنت ہے اُس پر۔"

دل ہی دل میں کہے ہوئے ان فقروں نے اُس کے غصّے کو کسی قدر کم کر دیا۔ طبیعت کی لاابالی، جو ابھی ساری انسانیت کو تباہ کرنے پر

تیار ہو گئی تھی، ٹھنڈی ہو گئی۔ تنہائی کا شدید احساس پیدا کرنے والی اُداسی اُس کی رُوح پر چھا گئی۔ جھکی ہوئی کمر پہ ہاتھ رکھے وہ چُپ چاپ وہیں کے وہیں کھڑا رہا، پتھر کے بے جان بُت کی طرح۔ زندگی میں پہلی بار وہ "اپنے آپ سے" شکست کھا رہا تھا۔ سو برس کی ایک ایک تصویر اُس کی آنکھوں میں گھومنے لگی۔ ایک ایک ذرّہ جو اُس نے دیکھا تھا، اُٹھ اُٹھ کر اُس کے سامنے آ گیا۔ اُس کی زندگی صاف شفاف، دُھلے ہوئے اُجلے کپڑے کی طرح بے داغ تھی۔ لیکن اُس کے دامن پر صرف ایک چھوٹا سا دھبّہ بھی تھا جو دوسروں کو تو نظر نہیں آ سکتا تھا، مگر اُسے صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے ایک انگریز سے رشوت لی تھی . . . .

اُس وقت وہ شریف آباد کا نہایت خوبصورت اور گبرو جوان تھا۔ چوڑا چکلا سینہ یُوں دمکتا تھا اور صحت مند بازوؤں کی مچھلیاں یُوں تڑپتی تھیں کہ شریف آباد کی کئی لڑکیاں اُس پر مٹ گئی تھیں۔ آخر پھوپھی نے اسے اپنی دامادی میں لے لیا تھا۔ اُس کی بیٹی کلثوم جلال جتنی خوبصورت تو نہ تھی مگر جلال پر اس کا حق فائق ضرور تھا، کیونکہ پھوپھی ہی نے اُس کی پرورش کی تھی۔ ماں تو اُس کی پیدائش کے چند ہی روز بعد مر گئی تھی اور پھوپھی

اتفاق سے ایک اندھیری کوٹھڑی میں چھپ جانے کی وجہ سے گوروں کی گولیوں سے زندہ بچ رہی تھی۔ پھوپھی ہی نے اُس کا نام جلال الدین رکھا تھا، بچپن میں تھپک تھپک کر گوروں سے انتقام لینے کی لوریاں سنائی تھیں۔ خود پھوپھی ہی نے اُسے قرآن مجید پڑھایا اور حفظ بھی اُنہی نے کرایا تھا۔ دس برس کی عمر میں حافظ قرآن بننے کے بعد اُس نے مزدوری شروع کر دی تھی۔ دیواروں پر چڑھے ہوئے معماروں کو وہ اینٹ گارا پکڑایا کرتا تھا۔ کئی برس بیت گئے۔ ایک دفعہ ایک راج نے اسے خوب پیٹا تھا اور وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے لگا تھا۔ اُس کا یہ کام خوب چل نکلا۔ ایک دن چند گورے شریف آباد کے کھیتوں میں ایک ہرن کا پیچھا کر رہے تھے تو اُسی نے وہ ہرن پکڑوایا تھا۔ اس کے بعد وہ گورے شکاریوں کا راہبر بن بیٹھا۔ شریف آباد کے اردگرد بیس بیس میل کے رقبے میں جنگلوں اور کھیتوں میں ہرن اور جھیلوں میں مرغابیاں اور بگلے خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ہر اتوار کو دلّی سے گوروں کی پارٹیاں شکار کھیلنے آتی تھیں اور اسی لئے شریف آباد اور دلّی کے درمیان ایک پکّی سڑک بنا دی گئی تھی۔ جلال الدین نے برس دو برس کی رہبری سے گوروں سے اتنا انعام حاصل

کر دیا تھا کہ ایک دن اُس نے جمع شدہ رقم سے نئی بیل گاڑی بنالی تھی۔ آٹھ
دس گورے اپنی بندوقیں تھامے اُس کی گاڑی میں بیٹھ جاتے تھے اور وہ
رُوئی کا کوٹ پہنے بیلوں کو ہرنوں کے پیچھے بھگاتا رہتا تھا۔

ایک دفعہ بیل گاڑی بڑی جھیل کھرکھودی کے کنارے پر آکر ٹھہر گئی
تھی جھیل کے دوسرے کناروں پہ سینکڑوں مرغابیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دو
گوروں نے ایک ساتھ نشانہ تاکا اور ایک ساتھ بندوق داغی۔ ایک مرغابی
کے ساتھ ہی وہ دھوبی بھی لوٹ پوٹ ہوگیا جو کمر کمر پانی میں کھڑا چھُوا چھُوکر کے
پتھر پر کپڑے پٹخ رہا تھا۔ گورے بیل گاڑی میں بیٹھ گئے اور اُنھوں نے
جلال الدین سے فوراً شریفہ آباد واپس چلنے کو کہا، لیکن وہ دھوکہ سے
بیل گاڑی تیزی سے بھگا کر جھیل کے دوسرے کنارے پر لے آیا اور فوراً
اُتر کر جھیل میں کُود گیا۔ تیراک وہ غضب کا تھا۔ ڈونگی جھیل کے وسط سے
دھوبی کی لاش باہر نکال لایا۔ ایک گورے نے کہا" اسے گڑھے میں دفنا
دے۔"

جلال الدین بولا" نہیں حضور، شریفہ آباد میں لے چلتے ہیں، کفن پہنا کر
نماز جنازہ پڑھ کر دفنائیں گے۔"

دوسرے گورے نے اپنے تھیلے سے بے شمار چاندی کے روپے نکال کر اُسے دیئے اور ابروؤں سے ترغیب دلاتے ہوئے کہا "نہیں، اسے ابھی چپکے سے گڑھے میں دفنا دے۔"

جلال الدین اُس کے بھورے بھورے ابروؤں میں چھپی ہوئی بے پناہ ترغیب سے بچ نہ سکا۔ لاش اُس نے گاڑی میں رکھ دی اور گاڑی کے نیچے جا کر گڑھا کھودنے لگا۔ گورے گاڑی کے اُن حصوں کو ڈھانپ کر کھڑے ہو گئے جو سڑک پر چلتی ہوئی گاڑیوں اور لاریوں سے صاف نظر آ سکتے تھے

تھوڑی ہی دیر بعد دھوبی کو گڑھے میں دفنانے کے بعد جلال الدین نے زمین ہموار کر دی اور دو سو روپے گانٹھ میں باندھ کر گاؤں میں آ گیا اور بیل کھول کر مسجد عالمگیری میں مغرب کی نماز پڑھانے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پنڈت نہرو نے "استغفراللہ" کہہ کر کانوں کو ہاتھ لگایا "جلال الدین! تیری نجات مشکل ہے۔ تیرا ٹھکانہ دوزخ ہے دوزخ۔" لیکن اگلے ہی لمحہ گناہ گاری کے اس وقتی احساس پر ایک اطمینان بخش احساس چھا گیا۔ اُس نے وہ رقم دوسرے دن ایک نیک مقصد پر صرف کر دی تھی۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اُس نے دیکھا کہ ایک نوجوان

معدّے کے پاس آیا اور لوگوں کو مخاطب کر کے ایک تقریر کرنے لگا۔ اُس نے کپڑے کی ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور کندھے پر پیلے رنگ کا ایک نفیس رومال پڑا ہوا تھا۔ نوجوان نے پُرجوش الفاظ میں تقریر کی "میرے بھائیو! لالاؤں کی قوم ہم سے پچاس برس آگے نکل چکی ہے۔ ہم جن کی قسمت میں حکمرانی ازل سے لکھی ہوئی ہے۔ محکوم و مقہور ہو گئے ہیں۔ مسلمانو! خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ اور اُس پاک نام کا اُجالا ساری دُنیا میں پھیلا دو۔ جس کی اُمت میں تم ہو، جس کے نام لیوا تم ہو۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مُرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوے
یتیموں کا والی غلاموں کا مولے

بھائیو! مردِ مجاہد سر سیّد احمد خاں کل صبح یہاں ریل گاڑی سے گزریں گے اُنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سینوں میں علم کی روشنی منوّر کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ یہ اُنھی کی کوششوں کا ثمر ہے کہ مسلمانوں کا ایک علیحدہ کالج علی گڈھ کے مقام پر کھُل چکا ہے۔ انگریز اور ہندو دل سے

اس کالج کے خلاف ہیں۔ شمعِ محمدی کے پروانو! اگر تمہاری رگوں میں ذراسی بھی غیرتِ اسلامی موجود ہے تو کل صبح ساڑھے آٹھ بجے ریلوے سٹیشن پر پہنچو اور اپنے رہنما کا شاندار استقبال کرو اور دل کھول کر کالج کے لئے چندہ دو۔"

نوجوان کی ایک گھنٹے کی جوشیلی تقریر نے شریفہ آباد کے نمازیوں کے علاوہ پیش امام کو بھی متاثر کیا۔ چاندی کے دوسو روپے جو دوپہر سے اُس کے ضمیر میں کانٹے کی طرح چبھ رہے تھے، اُس کے دماغ میں چندہ بن کر اُبھرے اور اس کا ارادہ بن گئے۔ اُس نے آدھی رات تک چند لوگوں کو ساتھ لے کر ایک ایک گھر سے چندہ وصول کیا۔ دوسرے دن سورج نکلتے ہی سارا شریفہ آباد سٹیشن پر جمع ہو گیا تھا۔ ٹرین چھک چھک کرتی آئی۔ پیلے رومال والے، صدا متبسّم نوجوان نے گاؤں والوں کی طرف سے پھولوں کا ہار سرسیّد احمد خاں کے گلے میں ڈالا جو اُلٹا اُنھوں نے نوجوان ہی کو پہنا دیا۔ لوگ اس نوجوان کی اتنی وقعت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لمبی نورانی ڈاڑھی والے شخص نے ہنستے ہوئے اُن کی حیرانی دُور کر دی اور بتایا کہ "یہ پانی پت کے الطاف حسین حالی ہیں،

تم لوگ اِنہی کی مسدّس مسجدوں کے منبروں پہ کھڑے ہو کر پڑھتے ہو۔"

جلال الدین پیش امام نے آگے بڑھ کر حالی کے ہاتھ چُوم لئے۔ اُسے اس شاعر کی مسدّس حفظ تھی اور جب وہ گوروں کو اپنی بیل گاڑی میں بٹھاکر شکار کھلایا کرتا تھا تو آگے بیٹھا مسدّس کے جوشیلے اشعار گنگناتا رہتا تھا۔

پھر جلال الدین نے گاؤں والوں کی طرف سے دو ہزار روپے کی تھیلی سر سید احمد خاں کو پیش کی، جس میں اُس کے بھی دو سو روپے شامل تھے....

اس اطمینان بخش احساس کے باوجود کہ اُس نے وہ رقم ایک نیک کام پہ صرف کر دی تھی، پنڈت نہرو کا ضمیر صاف نہ ہو سکا۔ اُداسی زیادہ گہری ہو گئی۔ بڑی بے چینی کے ساتھ وہ مُڑا اور اپنی جھونپڑی میں آیا۔ چھپر سے تھیلی اُتار کر ہاتھ میں لٹکا لی اور قرآن مجید چُوم کر، سینے سے لگا کر دوبارہ سرہانے رکھ دیا۔ اُس کا کھدر کا میلا کُرتا جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور بڑھاپا گورے جسم کی جُھریاں نمایاں کر رہا تھا۔ جھونپڑی سے نکل کر وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا اپنے سب سے چھوٹے پڑپوتے کے گھر میں آیا۔ کئی بچے اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ "پنڈت جی آ گئے، پنڈت جی آ گئے۔" اُس نے ایک چھوٹے سے توتلے بچّے کے سر پہ ہاتھ مارا،

جس میں اگرچہ اُس کا اپنا خُون تھا لیکن جس کے نام سے وہ بالکل ناواقف تھا
رتنہ کھنہ کی گلیوں اور کھیتوں میں ایسے کتنے ہی بچے اس وقت بھی بھُوکے
پیاسے کھیل رہے تھے جو اُس کے کسی نہ کسی پوتے یا پوتی، نواسے یا
نواسی کی اولاد تھے لیکن وہ اُن کے نام تک نہ جانتا تھا۔ اُس کی نواسی کی
نواسی آٹا گوندھتے گوندھتے دوڑ کر باہر آئی اور کہنے لگی "پنڈت جی، کیا
چاہیئے؟"

پنڈت نہرو نے کہا۔"بیٹی ذرا میری لاٹھی تو ڈھونڈ دے۔"

وہ جھونپڑی سے اُس کی لاٹھی اُٹھا کر لے آئی۔ پنڈت نہرو نے لاٹھی
پر اپنے نحیف جسم کا بوجھ ڈالتے ہوئے محض تصدیق کے لئے پُوچھا
"پانی آیا کہ نہیں۔"

لڑکی نے کہا۔" پرسوں کا تھوڑا سا پانی بچا ہُوا تھا، اُس سے آٹا
گوندھ رہی ہوں۔ کنوئیں میں کتّا گر گیا ہے۔"

پنڈت نہرو نے اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔" اچھا بیٹی جو اللہ
کی مرضی۔ یہ سب ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔"

پھر وہ بیری کے نیچے سے نکل کر اُس پگڈنڈی پر ہو لیا جو کھیتوں میں

سے ہوتی ہوئی نہر کے پل تک گئی تھی۔ پگڈنڈی بھی اپنی منزلِ مقصود کو جانتی تھی کہ فلاں جگہ پر جا کر ختم ہو جانا ہے، لیکن پنڈت نہرو نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، مگر وہ جا رہا تھا زمین پر لاٹھی ٹیکتے ہوئے، آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے، کمر جھکائے ہوئے، دل میں ناقابلِ برداشت بے چینی لئے ہوئے۔ بیری کے ساتھ والی کھائی پر آ کر اس نے ویسے ہی مڑ کر رتہ کھنہ کی طرف دیکھا۔ بالکل شریفہ آباد کا سا منظر تھا۔ وہی پُختہ عمارتیں وہی پتلی پتلی گلیاں اور وہی اُونچے اُونچے درخت۔ کچھ بچے اس کے قریب ہی کھڑے اُچھل اُچھل کر نعرے لگا رہے تھے۔

دو بچے بیک آواز کہتے "پنڈت نہرو۔"

باقی سب بچے جواب دیتے "ہائے ہائے۔"

وہی دو بچے پھر کہتے "پانی روکا۔"

باقی سب بچے دہراتے "ہائے ہائے۔"

"پنڈت نہرو۔"

"مُردہ باد"

پنڈت نہرو پر جوانی آ گئی۔ پورے جلال سے گرجا "اوئے حرامزادو!

چُپ رہو۔" وہ یہ برداشت ہی نہ کر سکتا تھا کہ کوئی اُس شخص کو بُرا کہے جس کا احترام وہ دل و جان سے کرتا تھا، جس کی شخصیت اُس کی زندگی کے فلسفے کی رہنمائی کرتی رہی تھی۔ بچّے دم بخود رہ گئے۔ چُپ چاپ کھڑے اپنے جدِّ امجد کی غصیلی صورت تکتے رہے۔ پھر جب پنڈت نہرو نے لاٹھی کے اشارے سے اُنھیں واپس چلے جانے کو کہا تو وہ دوڑتے ہوئے گاؤں میں آ گئے۔

پنڈت نہرو ابھی تک اپنے اوّلین احساس میں ڈوبا ہوا تھا کہ یہ اُس پنڈت نہرو کو نہیں مجھے مُردہ باد کہہ رہے ہیں۔ "یہ سب میرے گناہوں کی سزا ہے۔ لیکن آخر کیوں؟ میرا قصور کیا ہے؟ اگر کوئی دریاؤں کا رُخ موڑ دے اور نہروں کا پانی بند کر دے تو اس کا تعلق اُن لوگوں کے گناہوں سے کیا ہے جن پر یہ ستم ہُوا ہے۔ نہیں کبھی نہیں۔ جواہر لال نہرو تو ایک قطرہ پانی بھی کسی کا نہیں روک سکتا۔ وہ برہمن ہے، ہندوؤں کا سیّد ہے۔ وہ یزید نہیں بن سکتا۔ یہ سب سہروردی کا پروپگنڈا ہے ..... نہیں، میرے گناہوں کی سزا ہے۔"

گناہوں کی سزا کا خیال اُس کے دماغ پر چھایا ہُوا تھا اور وہ سوچ

میں ڈوبا ہوا، پسینے میں شرابور، کھائی پر چل رہا تھا۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ جواہر لال تو گناہوں کی سزا کا قائل ہی نہیں ہے۔ اُس نے پاکستان بننے سے پہلے اُس کی لکھی ہوئی ایک کتاب پڑھی تھی جس میں سول نافرمانی کی ناکامی کے اسباب گنوائے گئے تھے۔ ایک جگہ جواہر لال نے لکھا تھا کہ جب یہ تحریک ناکام ہو گئی تو مجھے بڑا غصہ آیا، کیونکہ ہم سب جیل میں تھے اور گاندھی جی نے باہر سے کسی سے مشورہ لئے بغیر ایک کامیاب ہوتی ہوئی تحریک ختم کر ڈالی۔ میں گاندھی جی سے ملنے گیا اور اُن سے اپنے غصے کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا۔ یہ سب ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ اُس وقت تو جواہر لال نے احترام کے خیال سے کچھ نہ کہا۔ لیکن کتاب میں یہ لکھا کہ یہ ہمارے گناہوں کی سزا نہیں، بلکہ ہماری بزدلی اور عدم تشدد کی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ وہ پھر سوچنے لگا کہ یہ سب سہروردی کا پروپیگنڈا ہے۔

جب سے بھارت نے نہر بند کی تھی، اُس کا یہی اعتقاد تھا، کہ جب تک پنڈت نہرو زندہ ہے۔ پاکستان میں آنے والے دریاؤں کا رُخ مڑ سکتا ہے نہ کسی نہر کا پانی بند ہو سکتا ہے۔ اُس رات رتنہ کھنہ کے

مزارعوں کی پنچایت طویلہ کے صحن میں ہوئی تھی۔ اُن کی ایک درخواست کی تعمیل میں نائب تحصیل دار آیا ہوا تھا۔ اُنھوں نے ڈپٹی کمشنر سے پچھلی فصل کا لگان معاف کرنے کی درخواست کی تھی۔

پنڈت نہرو نائب تحصیلدار کے پاس ہی مونڈھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ مزارع بار بار اپنے آج کے مسائل پر گفتگو کرنا چاہتے تھے، لیکن پنڈت نہرو ہر بار نائب تحصیلدار کے ذہن کو ماضی میں لے جاتا تھا۔ آخر ایک دفعہ اُس نے غصّہ میں آکر کہہ دیا۔ "مجھے قسم ہے اپنے رب کی، پنڈت نہرو پانی بند نہیں کر سکتا۔"

"ضلعدار نے پوچھا" کیوں نہیں کر سکتا؟"

پنڈت نہرو نے کہا "اُس کی فطرت ہی میں یہ بات نہیں ہے۔"

نائب تحصیلدار نے سمجھایا "بزرگوار، بھارت ہی نے پانی روکا ہوا ہے۔ ہماری شکایت پر وہ کبھی کبھی دو چار روز کے لئے تھوڑا بہت پانی چھوڑ دیتے ہیں اور پھر روک لیتے ہیں۔"

پنڈت نہرو نے چڑ کر کہا "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

نائب تحصیلدار نے اب بھی اپنا سمجھانے کا رویہ نہ چھوڑا۔ "دراصل

وہ مشرقی پنجاب کی زمینوں کو سیراب کرنا چاہتے ہیں۔"

پنڈت نہرو نے نائب تحصیلدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا" بات یہ ہے، میں پنڈت نہرو کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر ایک ہزار انسانوں کو پانی پلانے کے لئے اُسے ایک انسان کو پیاسا رکھنا پڑے گا تو وہ ایسا نہیں کرے گا۔ میں اُسے اچھّی طرح جانتا ہوں۔ فرشتہ ہے فرشتہ۔"

پٹواری بولا" تمہارا وہی فرشتہ پانی روک رہا ہے۔"

پنڈت نہرو کو غصّہ آگیا" کیا بچّوں والی بات کرتے ہو جی۔ جب سے دُنیا بنی ہے، ستلج اور راوی ایک ہی رُخ بہہ رہے ہیں۔ چندر گپت موریہ اور اشوک اعظم کے زمانے سے دریاؤں کا وہی راستہ چلا آرہا ہے جو دُنیا کے بنانے والے نے شروع سے متعیّن کر دیا ہے۔ بھلا پانی بھی کسی نے روکا ہے۔ پانی اور ہوا اور آگ ہر انسان کی خُدائی جائداد ہے، اُنھیں کوئی کِسی سے نہیں چھین سکتا۔"

نائب تحصیلدار کہنے لگا" مولوی صاحب! یہی تو میں کہہ رہا ہوں بھارت تو چھین رہا ہے نا۔"

پنڈت نہرو بولا "آپ کا یہ سہروردی چھنوا رہا ہے۔ فیروز خاں نون چھنوا رہا ہے۔ یاد ہے آپ کو غلام محمد، شوکت حیات اور دولتانہ نے دلّی جاکر کیا معاہدہ کیا تھا؟ یہ سب اپنے اقتدار کی خاطر ہندوستان کے افسروں سے ملے ہوئے ہیں۔ پنڈت نہرو بے چارے کو تو معلوم بھی نہ ہوگا۔ اُنھوں نے دانستہ پانی رُکوایا ہے تاکہ شور مچا کر عوام کو جوش دلائیں اور جب نہر کھُل جائے تو داد خود لے جائیں۔"

نائب تحصیلدار نے پُوچھا "افسروں سے وہ کیسے مل سکتے ہیں؟ اور ایک دفعہ نہر بند کرا کر کیسے کھُلوا سکتے ہیں؟"

پنڈت نہرو نے جواب دیا "ارے جناب، رشوت دی ہوگی رشوت۔ آخر پیسے والے لوگ ہیں۔"

پٹواری نے کہا "اچھا پنڈت جی، چلو ہم تمھاری یہ بات مان لیتے ہیں کہ پانی ہمارے لیڈروں نے رُکوایا۔ کشمیر کے بارے میں حضور کا کیا خیال ہے؟"

پنڈت نہرو اس سوال پر جھنجھلا گیا۔ پٹواری کو نظر انداز کر کے نائب تحصیلدار سے کہنے لگا "میں تو شروع ہی سے پاکستان کا مخالف ہوں

. . . . اب تو کشمیر کا مسئلہ بھی چھڑے گا، نہروں کا بھی، دریاؤں کا بھی۔ آپ دیکھتے جائیں، کیا کیا ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے گاندھی جی کو، ہندوستان کو اُس نے مروایا۔ سچے کانگرسی پہلے دن سے سوراج کے قائل تھے، مگر وہ سوراج تلوار کے زور سے لینا چاہتے تھے، بھیک نہیں مانگتے تھے، لیکن گاندھی جی کیونکہ سب کے بزرگ تھے اس لئے اُن کی ہر جائز و ناجائز بات ہم کو تسلیم کرنی پڑتی تھی۔"

نائب تحصیلدار نے صیغہ "ہم" کے خاص انداز سے متاثر ہو کر پوچھا "تو کیا آپ کانگرسی تھے؟"

پنڈت نہرو نے قہقہہ لگایا "تھا کیا اب تک ہوں۔"

نائب تحصیلدار نے کہا "بہت خوب۔"

پٹواری نے موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "قائدِ ملت نے ایک دفعہ کہا تھا کہ . . . . "

پنڈت نہرو کو اس نام سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ دفعتہً چلّا اُٹھا "کیسے قائدِ ملت اور کیسے قائدِ اعظم، یہ سب انگریزوں کے . . . . "

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن اُس کے ایک نوجوان پڑپوتے نصیرالدین نے حقہ کی نے ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے ٹوک دیا۔ "قائدِ اعظم کی شان میں کچھ کہا تو اچھا نہ ہوگا۔"

پنڈت نہرو شیر کی طرح گرجا۔ "خبردار، جو بڑوں کی باتوں میں بولا ہوگا۔ منہ توڑ دوں گا۔"

"منہ توڑ دوں گا۔ ہونہہ، آئے بڑے منہ توڑنے والے۔" نصیرالدین نے غصّہ میں چیکے سے کہا۔

پنڈت نہرو نے اُس کے سر پر لاٹھی دے ماری۔ "دُور ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے، ورنہ ابھی ذبح کر دوں گا حرام زادے کو میں کہتا ہوں چلا جا یہاں سے۔ اُٹھتا ہے کہ نہیں" وہ اسے مارنے کے لئے اُٹھا تو پٹواری اور ایک مزارع نے اُسے روک دیا۔ دو مزارع نصیرالدین کو پکڑ کر گھر کی طرف لے گئے۔

نصیرالدین کے دادا اجمیل الدین کو غصّہ آگیا۔ اُس نے اپنی سفید لمبی ڈاڑھی ہلاتے ہوئے نائب تحصیلدار سے کہا۔ "قبلہ! اس وقت دُنیا کی اربوں آبادی میں صرف دو پنڈت نہرو رہتے ہیں۔ ایک تو ہندوستان کا

وزیر اعظم ہے اور ایک یہ رتہ کھنہ میں رہتا ہے۔" وہ پنڈت نہرو کا سولہواں سب سے چھوٹا اور اسی لئے لاڈلا بیٹا تھا اور اس کی تیسری بیوی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔

نائب تحصیلدار کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی قہقہے لگانے لگے۔ پٹواری طنزاً کہنے لگا "ہمارا نہرو ہندوستان کے نہرو سے کچھ کم تو نہیں ہے۔"

پنڈت نہرو اس فقرے کی مہمیز سے دفعتہً ماضی میں ڈوب گیا۔ "اس میں جھوٹ بھی کیا ہے۔ میں اس سے زیادہ جیلوں میں رہا ہوں۔ اس سے زیادہ قربانیاں دی ہیں، اس سے زیادہ مصیبتیں جھیلی ہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ وہ مشہور ہو گیا ہے مجھے سوائے میرے کوئی جانتا نہیں۔"

ایک اعتبار سے پنڈت نہرو بالکل سچا تھا۔ اس کی بیشتر زندگی قید خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں اور ڈرانے والے لمبے لمبے بارکوں میں بسر ہوتی تھی۔ سب سے پہلے وہ تحریک خلافت کی پرزور حمایت کرنے کے باعث علی برادران کے ہمراہ جیل گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ انہیں

سپیشل کلاس ملی تھی اور وہ اپنی تحصیل کی اونی جیل ہیں مقید رہ گیا تھا۔ اُس پر الزام یہ تھا کہ اُس نے مسلمانوں کو فوج ہیں بھرتی ہونے سے روکا تھا اور باغی لیڈروں کی حمایت پر اکسایا تھا۔ دس ماہ بعد اُسے رہا کر دیا گیا تھا اُس نے جیل یاترا پہلی بار چھپن سال ہی عمر کی تھی۔ یہ وہ عمر ہے جب ہندوستانیوں کو انگریزوں کی خدمت سے سبکدوش کر دیا جاتا تھا۔ اور اُنھیں تا دمِ مرگ ایک خاص ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا جسے وہ پنشن کہتے تھے۔ جیل کی کوٹھڑی ہیں کئی بار اُس نے اپنی ڈاڑھی ہیں سفید بالوں کی جھلکیاں دیکھ کر بڑھاپے کی آمد کا نظارہ دیکھا تھا۔ اُس وقت اُس کا سب سے چھوٹا بیٹا جمیل الدین بمشکل آٹھ برس کا تھا۔ پھر ۱۹۱۹ء میں جب جلیانوالہ باغ میں گوروں نے مارشل لا کا سہارا لے کر گولیوں سے ہندوستانیوں کا سینہ چھلنی کیا تھا اور اُنھیں سانپوں کی طرح پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا تھا تو پنڈت نہرو نے مسلم شہدا کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی تھی اور شریف آباد کی عالمگیر مسجد میں ایک احتجاجی جلسہ کیا تھا اور اسی جرم کی پاداش ہیں ڈیڑھ برس تک سونی پت جیل ہیں چکی پیستا رہا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں سول نافرمانی اور ترک موالات کی تحریک چلی تو جواہرلال نہرو نے معاشرے کے اونچے طبقے

سے اُتر کر کسانوں، کاشتکاروں اور مزدوروں کی طرف توجہ دی۔ دِن رات اُن کی موٹر دیہات کے گرد و غبار میں گھومتی رہتی تھی اور بعض اوقات اُس رئیس زادے کو کئی کئی میل کھیتوں کے دشوار گزار راستوں پر پیدل چلنا پڑتا تھا۔ اُسی زمانے میں جب وہ دہلی کے قرب و جوار کا دورہ کر رہے تھے، تو پنڈت نہرو نے اُنھیں ایک جذباتی خط لکھ کر شریف آباد آنے اور کسانوں کی حالتِ زار دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ جواہر لال کی سیاہ کار اگلے ہی دن مڈل سکول کی عمارت کے پاس اڈے پر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اڈے کے چھوٹے چھوٹے دکانداروں نے "زندہ باد" کے نعرے لگائے تھے۔ ایک شخص دوڑ کر پنڈت نہرو کو مسجد سے بُلا لایا تھا۔ اُس دن پنڈت جی نے خاص طور پر انگرکھا پہنا تھا۔ یہ دونوں نہروؤں کی پہلی ملاقات تھی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ٹانگوں کے اڈے سے پرے پکّے باغ کے برابر والے وسیع میدان میں کسانوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگ گیا تھا۔ جواہر لال نہرو نے دس منٹ کی تقریر میں اُنھیں بتایا تھا کہ اب بہت جلد ہندوستان کو سوراج حاصل ہو کر رہے گا۔ کیونکہ اب یہاں کے عوام بیدار ہو چکے ہیں۔ میں کئی ماہ سے دیہات کا دورہ کر رہا ہوں۔ میں جہاں بھی گیا ہوں، میں نے

یہی دیکھا ہے کہ کسان شہری لوگوں سے زیادہ جوشیلے ہیں اور آزادی کی دیوی پر جان کی بازی لگانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ کسانوں کا جوش و خروش دیکھ کر مجھے اپنی سیاسی زندگی میں پہلی بار یہ یقین ہوا ہے کہ ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی بہت مضبوط ہے۔" جواہر لال کے بعد جلال الدین نے ایک ایسی جوشیلی تقریر کی اور ایسے رواں دواں جملے اُن کی زبان سے نکلے کہ جواہر لال اُنھیں موٹر میں بٹھا کر اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ سنہ ۱۹۲۱ء کی سول نافرمانی شروع ہو چکی تھی۔ مُلک کے چپّے چپّے سے لوگ اپنے آپ کو گرفتاریوں کے لئے پیش کر رہے تھے۔ اُس زمانے میں انگریز اور اُس کی پولیس سے ہتھکڑیاں لگوانا اور جیل جانا کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ جلال الدین اور جواہر لال ایک ہی دن ایک ہی مقام سے گرفتار ہوئے اور ڈسٹرکٹ جیل لکھنؤ بھیج دیئے گئے۔

عام سیاسی قیدیوں کو جیل خانے کے اندرونی حصّے میں بڑی بڑی بارکوں میں رکھا گیا۔ اٹھارہ اشخاص کو کچھ بہتر سلوک کا مستحق سمجھا گیا اس لئے اُنھیں ایک پُرانے پارچہ بافی کے کارخانے میں جگہ دی گئی۔ جس کے سامنے بہت بڑا صحن بھی تھا۔ موتی لال نہرو، ان کے بیٹے جواہر لال نہرو اور اُن کے دوسرے دور رشتہ داروں کو ایک علیحدہ سائبان ملا جو بیس فٹ لمبا اور سولہ فٹ

چوڑا تھا۔ ان اٹھارہ آدمیوں کو بارکوں میں جانے کی کھلی آزادی تھی۔ سائبان
والوں کو اخبار بھی پڑھنے کو ملتے تھے۔ عزیز و اقارب سے ملنے جلنے کی اجازت
بھی تھی۔ وہ ہر وقت گرما گرم سیاسی بحث مباحثے بھی کر سکتے تھے۔ اس کے
برعکس بارکوں کے قیدیوں کو برآمدے سے باہر قدم رکھنے کی بھی اجازت
نہ تھی۔ جلال الدین صبح اُٹھتے ہی اپنی بارک کے برآمدے میں صافہ بچھا کر نماز
پڑھتا اور دیر تک وظیفہ پڑھتا رہتا۔ وظیفہ پڑھتے وقت وہ اپنا مُنہ سائبان
کی طرف کر کے بیٹھ جاتا اور مسلسل اُس گورے چٹے جذباتی اور چپ چہرے
شخص کو تکتا رہتا جو اُسے اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا لایا تھا۔ اور جو دوسرے
سپیشل قیدیوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ مُنہ اندھیرے اُٹھ کر سائبان سے
باہر نکل آتا تھا اور کپڑے اتار کر جانگیہ باندھ کر ورزش کرتا تھا۔ جب وہ زمین
پہ سر رکھ کر اور ٹانگیں دیوار کے ساتھ لگا کر اُلٹا لٹکتا تھا تو جلال الدین کو
بڑی ہنسی آتی تھی اور چند منٹوں کے لئے اُس کی اُنگلیاں تسبیح کے دانوں کو ٹٹولنا
بھول جاتی تھیں۔ ورزش کے بعد وہ شخص جس کے خوبصورت کسرتی بدن پر
شباب کی آخری جھلکیاں ابھی دمک رہی تھیں، سارے کمرے کو جھوتا تھا
جھاڑو دیتا تھا۔ پھر پیپل کے درخت کے نیچے نلکے پر بیٹھ کر صابن کے جھاگ کے

پھوٹے جھاگ اُٹھا کر اپنے والد کے اور اپنے کپڑے دھوتا تھا۔ دُھلے ہوئے کپڑے دھوپ میں تنی ہوئی رسی پہ ڈال کر گیروے رنگ کا کھدر کا کرتا پہن کر وہ چرخہ کاتنے بیٹھ جاتا تھا اور جلال الدین وظیفہ ختم کرکے بارک میں چلا جاتا تھا اور کاپی پر کل کے دیئے ہوئے اُردو فقروں کا انگریزی ترجمہ کرنے لگتا تھا" ہم سیاسی قیدی ہیں۔ وی آر پولیٹیکل پریزنرز۔" اُس کے اُستاد کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی تھی کہ وہ ہجے غلط لکھتا ہے، اس لئے وہ ایک ایک لفظ چبا کر لکھتا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب اُس کا اُستاد گیروے رنگ کا کرتا پہنے بارک میں آتا اور رضا کار قیدیوں کو پڑھانے بیٹھ جاتا۔ کسی کو اُردو پڑھاتا کسی کو ہندی کا سبق دیتا۔ پنڈت نہرو نے پنڈت نہرو سے انگریزی زبان لکھنؤ جیل ہی میں سیکھی تھی۔

تین ماہ بعد جواہر لال اور اُن کے سپیشل ساتھیوں کو رہا کر دیا گیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ پھر اُسی جیل میں آ گئے۔ اب جیلر نے جسے حال ہی میں 'خان صاحب' کا خطاب مل چکا تھا، خاصی سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ قیدیوں کا آپس میں ملنا جلنا بھی بند ہو گیا تھا۔ ایک روز ایک انگریز پولیس افسر جیل کا معائنہ کرنے آیا تو اُس کی بارک میں بھی آیا۔ وہ افسر جیلر اور سپرنٹنڈنٹ کو ساتھ لئے

پنڈت نہرو کے پاس سے گزرا تو اُس نے اُس کی کھچڑی ڈاڑھی پکڑ کر پوچھا

"مولانا! تُم کیا مانگتا اے۔"

"آزادی۔"

"ام تمہاری کال کھینچ لے گا۔"

"ام تیار این۔"

انگریز افسر نے جیلر کو حکم دیا کہ وہ مولوی کو جیل کے صحن میں لے آئے ہم اُسے آزادی دیں گے۔ حکم کی فوری تعمیل کی گئی۔ پنڈت نہرو کا صافہ اور کُرتا اُتار لیا گیا۔ ابھی ہندوستان کی رگوں میں بغاوت کا جوش اتنا شدید نہیں ہُوا تھا کہ اُس کا تہبند بھی اُتارا جاتا۔ جیلر اور سپرنٹنڈنٹ کے علاوہ چھ سپاہی اُس کے چاروں طرف کھڑے ہوئے تھے کہ وہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ کوڑے لگانے والے کا انتظار ہو رہا تھا۔ صحن سے دُور بارکوں کے عین مقابل ایک اُونچے سے کمرے کے برآمدے میں سات اشخاص کھڑے ہوئے تھے جنھیں فساد کی جڑ سمجھ کر سب سے الگ رکھا گیا تھا۔ یہ پرشوتم داس ٹنڈن، مہادیو ڈیسائی، جارج جوزف، بال کرشن شرما، دیوداس گاندھی، جلال الدین کا دوسرا بیٹا فصیح الدین اور جواہر لال نہرو تھے۔ جواہر لال غصّے میں آگ بگولا

ہو رہے تھے۔ رواں رواں کانپ رہا تھا۔ کشمیری رخسار تمتما رہے تھے اور وہ بڑی بے چینی سے کمرے کی نچلی سیڑھیوں پر ٹہل رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ شرمندہ سے ہو رہے تھے کہ وہ مولوی صاحب کو اپنے ساتھ کیوں لے آئے تھے۔ اُدھر مولوی صاحب اپنی جگہ ننگے بدن کھڑے اس سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ اس امتحان سے کامیابی کس طرح نصیب ہو گی۔ اُسے اپنے بزرگوں کے کٹھن امتحانات یاد آ رہے تھے۔ اُس کے جدِّ امجد حضرت علی کی ایڑی میں جب بھالا گڑ گیا تھا اور کسی طرح نکلنے نہ پاتا تھا تو رسولؐ اللہ نے لوگوں سے چپکے سے کہا تھا، علیؓ جب نماز پڑھنے کھڑا ہو اور سجدے میں جائے تو بھالا نکال لینا۔ علیؓ اپنے معبود کو دل میں بسائے سجدے میں گئے تھے تو بھالا اُن کی ایڑی سے نکال لیا گیا تھا اور انھیں خبر تک نہ ہوئی تھی۔ یزید کی فوج امام حسینؓ کا سر اُن کے تن سے اُس وقت تک جدا نہ کر سکی تھی، جب تک کہ وہ عالمِ محویت میں سجدے میں نہ جا گرے تھے۔ جلال الدین کی رگوں میں علیؓ اور حسینؓ کا دوڑتا ہوا خون جوش میں آ گیا، کم از کم اُسے یہی محسوس ہوا۔ کوڑے لگانے والے دیو ہیکل، کالے بھجنگ شخص کی صورت دیکھتے ہی اُس نے قبلہ رو ہو کر مشکل کشا کا نعرہ بلند کر کے نیّت باندھ لی۔

پنڈت نہرو کی کمر پر کوڑے پڑ رہے تھے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ آنکھیں بند کئے، دانت بھینچے وہ چھٹے وقت کی نماز پڑھتا رہا۔ جلدی جلدی رکوع اور سجدے میں جاتا تھا اور پھر کھڑا ہو جاتا تھا۔ کوڑے لگانے والے کو اُسے سجدے کی حالت میں کوڑا رسید کرنے میں خاص سہولت رہتی تھی۔ جواہر لال نہرو سے ضبط نہ ہو سکا۔ جیل کے قواعد کی پرواہ کئے بغیر وہ چلاتے ہوئے اور زور زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے صحن میں آگئے انگریز افسر نے انگریزی میں کہا "آپ یہاں سے چلے جائیں ورنہ آپ کا بھی یہی حال بننے میں آپ کی بڑائی کام نہ آسکے گی۔"

جواہر لال نہرو کی شخصیت کی تعمیر مٹی سے زیادہ آگ سے ہوئی تھی، وہ آگ بگولا ہو گئے "میں تھوکتا ہوں تم پر اور تم جیسے سب لوگوں پر۔" یہ فقرہ زبان سے ادا ہوتے ہی اُنھیں خیال آیا کہ عدم تشدد کا نازک آبگینہ چکنا چور ہو گیا ہے۔ میں مہاتما گاندھی کو کیا مُنہ دکھاؤں گا۔ فوراً ہی اپنے پُرانے فقرے کو نئے لہجے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آپ اس غریب بڈھے کو کیوں مارتے ہیں۔ اس کی جگہ آپ مجھے ماریں۔"

انگریز افسر نے کہا "آپ کا وقت بھی آنے والا ہے۔" پھر اُس نے

کوڑے والے سے کوڑا لے کر اور تین چار مرتبہ اپنے سر کے اُوپر سے گھما کر جلال الدین کی کمر پر رسید کیا جو اُس وقت رکوع کی حالت میں تھا۔ جواہر لال کی زبان سے نکلا تھا۔ "ہائے"۔۔۔۔

"ہائے" کہہ کر پنڈت نہرو نے کمر کے نچلے حصّے پر عین اُس جگہ ہاتھ رکھ لیا جہاں ایک انگریز نے اُسے کوڑا لگایا تھا۔ کوڑا چھتیس برس پہلے لگا تھا لیکن چوٹ اُس نے آج محسوس کی تھی۔ ایک ننھّی سی جبلت "ہائے" جو اُس کے حلق میں آزادی کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کی سرشاری میں اٹکی رہ گئی تھی، اب خود بخود باہر نکل کر ہوا کا جزو بن گئی۔ جون کا دہکتا ہوا سورج اُس کے بوڑھے چہرے کو جھلسا رہا تھا۔ وہ تین دن سے پیاسا تھا۔ اُس کے سوکھے حلق کو تر کرنے کے لیئے اُس کی زندگی کی خستہ عمارت کو کھڑا رکھنے کے لیئے پانی کی ایک بوند بھی میسّر نہ آسکی تھی۔ حصولِ آزادی سے پیشتر جو اکیس سال کی سیاسی زندگی میں وہ تنتیس برس میں چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد تیرہ مرتبہ گرفتار ہوا تھا۔ اُنیس سو تیس کی دوسری سول نافرمانی کے موقع پر، جبکہ قانونِ نمک کے خلاف پورے برِّصغیر میں مظاہرے ہوئے تھے اور لگان نہ دینے کی تحریک زوروں پر تھی، اُسے کالے پانی کی سزا بھی ملی تھی اور

وہ مسلسل نو برس تک یعنی دوسری جنگِ عظیم کے آغاز تک جیل کی سختیاں برداشت کرتا رہا، جب لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند نے کانگریس کو حکومت خود اختیاری کے وعدے پر جنگ کا حامی بنا لیا تھا اور اُس نے کانگریس کی سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کی شرط مان لی تھی۔ پھر سن بیالیس میں جب کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلائی تھی تو چند فوجیوں نے اُسے شریف آباد سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ریل کی پٹڑی اکھاڑتے دیکھ کر اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں پہنائی تھیں۔ اُسے وہیں پٹڑی کے درمیان روڑیوں پر بھاری بھاری جوتوں سے ٹھکرایا گیا تھا اور تپتی ہوئی پٹڑی پر اُس کا ایک گال رکھ کر دوسرے گال پر جوتوں کی کیلیں چبھوئی گئی تھیں۔ پھر بالکل ننگا کر کے اُس کے جسم کے اُن حصوں میں سنگین کی نوک چبھوئی تھی جن کو کپڑے سے ڈھانپے رکھنا دنیا کے تمام مذاہب میں جائز سمجھا جاتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے بیسیوں راز اُس کے سینے میں دفن تھے۔

پٹواری نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ "ہمارا نہرو ہندوستان کے نہرو سے کچھ کم تو نہیں ہے۔" اُس نے جواہر لال نہرو سے زیادہ مصیبتیں جھیلیں اُس سے زیادہ قربانیاں دیں، لیکن اُس نے اپنی قربانیوں کا تذکرہ کسی

کتاب میں نہیں لکھا، اپنی مصیبتیں کسی پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر عوام کو نہیں سنائیں۔ اپنا بایاں کان جو ستیاگرہ کی تحریک کے موقع پر دور سے آتی ہوئی ایک گولی کے ساتھ اُڑ گیا تھا، کسی کو نہیں دکھایا۔ ران پہ لگی ہوئی گولی کا زخم کسی آنکھ کی دید کا مرہم حاصل نہ کر سکا۔ ہاتھوں، پیروں اور گردن پہ کھائے ہوئے ڈنڈوں اور کوڑوں کی دکھائی نہ دینے والی چوٹیں اور پولیس کی مار سے ٹوٹا ہوا، جھکا ہوا کندھا صدی کے اختتام سے صرف دو ماہ پہلے اسے بار بار یاد آ رہا تھا۔ یہ چوٹیں اس نے آج سے پہلے ایک دن بھی محسوس نہ کی تھیں۔ ایک ان دیکھے مقصد کی بلندی، عظمت اور شرافت، جو اس نے اپنے اوپر طاری کر رکھی تھی، اس کی رگ رگ میں اس طرح رچ گئی تھی کہ اسے اپنے مقصد کے علاوہ کسی اور چیز کے دیکھنے یا حاصل کرنے کی خواہش ہی نہ رہی تھی۔ احساسات کا دھارا اُسے ایک ہی رُخ پر بہائے لئے جا رہا تھا اُس نے اس دھارے سے ہٹ کر، ایک طرف کھڑے ہو کر پہلی مرتبہ سوچا۔ "اگر میں مسلم لیگ میں شامل ہو گیا ہوتا ؟" اگلا لمحہ اس سوال کا جواب لئے اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ "ہوتا کیا، یہ مصیبتیں نہ اٹھانی پڑتیں۔" اگلا لمحہ ایک اور ہی سوال اُس کے ذہن میں ڈال گیا۔ "کیا تجھے پانی بھی مل جاتا ہے؟"

ایک عجیب گڑگڑاہٹ اُس کے استعمال شدہ بوڑھے دماغ کی ٹوٹی پھوٹی مشین میں ہونے لگی۔ وہ چکرا سا گیا۔ بڑے اضطراب سے جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا وہ کچے کنوئیں کی مینڈھ پر جا کر بیٹھ گیا۔ یہ کنواں آزادی سے پہلے رنہ کھنہ کے سکھوں نے مشترکہ سرمایہ سے بنانا شروع کیا تھا لیکن ۴۷ء کی وجہ سے اُدھورا ہی رہ گیا تھا اور آج تک اُسی طرح اُدھورا ہی پڑا تھا۔ خطوط کی تھیلی مینڈھ پر رکھتے ہوئے اُس نے کہا "واہ پنڈت جی! اس خطا پہ مجھے مارا کہ خطاوار نہ تھا۔ تم سے یہ توقع نہ تھی۔"

اُس کا ایمان متزلزل ہو رہا تھا۔ اُسے پہلی بار یقین سا آ رہا تھا کہ پانی پنڈت نہرو ہی نے روکا ہوگا، ورنہ افسروں کی یہ مجال کہاں۔ جواہر لال سے اپنے پُرانے تعلقات کی بھولی بسری یادیں اُسے ستانے لگیں۔ خیالات کا ایک ہلکورا اُسے سیاست کی کج روی سے نکال کر مذہب کی آغوش میں لے گیا۔ لیکن مسلمانوں کی طرح اُس کے پاس بھی لے دے کر ایک ماضی ہی تھا اُس کی رُوح پر چھائی ہوئی آج کی پریشانیوں کا مرکز "پانی" اُسے کھینچ کر میدانِ کربلا میں لے گیا۔ اُس نے گردن گھما کر تپتے ہوئے کھیتوں کے سلسلے پر نظر ڈالی۔ دُور دُور تک درختوں اور پودوں کی عدم موجودگی، ایک میل پر بہتی ہوئی

سوکھی ہوئی نہر، آسمان پر تنی ہوئی نیلی چادر، زمین پر برستی ہوئی چلچلاتی ہوئی دھوپ'
کچے کنوئیں کی تپتی ہوئی مینڈھ، ولولوں اور اُمنگوں سے پکا ہوا ذہن، بیکیوں
اور شرافتوں سے بھری ہوئی رُوح، زخموں، چوٹوں اور قربانیوں سے تھکا
ہوا جسم، تین دن کا پیاسا جسم، اور اُس کا یہ محسوس کرنا کہ میں بھی اولادِ نبی ہوں
— ایک چھوٹا سا میدانِ کربلا۔

ظہر کا وقت آن لگا تھا۔ اُس نے کنوئیں سے اُتر کر زمین پر بیٹھ کر،
کانپتے ہاتھوں سے تیمّم کیا اور نیت باندھ کر اپنے اُوپر ایک اور ہی امتحان
طاری کر کے دھوپ ہی میں کھڑا ہو گیا۔ نماز پڑھتے وقت مافوق الفطرت
اُس پر اس قدر چھا گئی کہ وہ بلا وجہ اس خواہش میں ڈوب گیا کہ میرے نماز
پڑھتے پڑھتے آسمان سے پانی برسنے لگے تو مزہ آجائے۔ یہ خواہش
اُس کے ذہن کو تھوڑی دیر بعد برسنے والے پانی کے بجائے ماضی میں
برسے ہوئے پانیوں کی طرف لے جا رہی تھی۔ ۲۸ء میں بھی سارا سال
بارش نہ ہوئی تھی۔ ہرے بھرے کھیت سُوکھ کر بنجر ہو گئے تھے۔ اُسی سال
اتفاق سے ایک ایسی بیماری پھیلی تھی کہ آدمی کو بخار چڑھتا تھا اور وہ
چٹ پٹ دوسرے تیسرے دن مر جاتا تھا۔ اُس کی پہلی دونوں بیویاں

تین بیٹیاں اور دو بیٹے بھی اسی بیماری کی زد میں آکر چل بسے تھے۔ اُس کا
سب سے بڑا بیٹا بھی، جس پر وہ جان چھڑکتا تھا، اسی بیماری میں اللہ کو
پیارا ہو گیا تھا۔ ایسے ایسے پیاروں کے چھن جانے کی وجہ سے اُس کا دل
ٹوٹ گیا تھا اور اُس نے مذہب میں سکون حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، نماز
تو وہ بچپن سے پڑھتا آیا تھا۔ لیکن اب کسی مُرشد کی تلاش اُسے بُری طرح
ستانے لگی تھی۔ ایک دفعہ وہ حضرت نظام الدین اولیا کے عُرس پر دہلی گیا
تھا اور وہاں خواجہ حسن نظامی کو ایک قوالی پر سر دُھنتے اور دھاڑیں مارتے
دیکھا تھا۔ جلال الدین اس منظر سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اُس نے اُسی وقت
خواجہ کے پیروں میں شیرینی رکھ دی تھی اور اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل
ہو گیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد اُس نے اپنے مرشد کو شریف آباد میں بُلایا تھا۔
مُرشد اپنے چار مریدانِ باصفا کے ساتھ اُس کے گاؤں میں عصر کے وقت
پہنچے تھے۔ مرید اُنھیں پیر حالی شہید کے مزار پر لے گیا۔ خواجہ پر فاتحہ پڑھتے
پڑھتے جذب کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ واپسی میں اُنھوں
نے مولوی جلال الدین کو بتایا تھا کہ یہ زبردست بزرگ ہیں اور چوتھی صدی
ہجری سے یہاں مقیم ہیں۔ رات کو اُس نے محفلِ میلاد منعقد کی تھی اور سارے

شریف آباد کو بُلایا تھا۔ میلاد کے بعد اُنھیں اپنے مکان کی کھُلی چھت پر سُلایا۔
دُوسرے مُرید خواجہ کو پنکھا جھل رہے تھے اور جلال الدین مُرشد کی ٹانگیں
دبا کر ثواب حاصل کر رہا تھا۔ خواجہ بار بار کہہ رہے تھے کہ یہاں تو بہت گرمی
ہے۔ جلال الدین نے ڈرتے ڈرتے ایک دفعہ اپنی خواہش کا اظہار کر ہی
دیا۔ "تو میرے خواجہ! آج ہو جائے بارش۔" اس خواہش کا اظہار کرتے
وقت اُس نے سوچا تھا کہ دیکھیں ہمارے مرشد میں کتنی طاقت ہے۔ خواجہ
نے کہا تھا۔ "اچھا، خدا تعالیٰ کو منظور رہا تو آج بارش ہو جائے گی۔" پھر سب
سو گئے تھے لیکن جلال الدین خوشی کے مارے جاگتا رہا تھا۔ کبھی چمکتے ہوئے
ستاروں کو دیکھنے لگتا کبھی اپنے مُرشد کے مسکراتے ہوئے چہرے کو۔
آدھی رات کے قریب زور کی آندھی چلی تھی، آناً فاناً بادل چھا گئے۔ مسلسل
دو روز تک اتنا مینہ برسا کہ لوگوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں اور
"جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔" کا وظیفہ اُن کے ہونٹوں پہ آ گیا۔
پنڈت نہرو نے سلام پھیر کر دُعا مانگی۔ بڑی مشکل سے اُٹھا اور رات کے
دوسری رکعت کی نیّت باندھنے سے پہلے خلوصِ قلب کے ساتھ مُرشد کو
یاد کیا اور کہا۔ "یا خواجہ! تو ہو جائے بارش" نیت باندھ کر الحمد شریف

پڑھنے لگا تو ایک ویسا ہی واقعہ دُور دراز سے لپکا ہوا آیا اور بجلی کی طرح اُس کے ذہن میں کوند گیا۔ اکیس روز کا مرن برت رکھنے کے بعد جب گاندھی جی دہلی آئے تھے تو ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی روہتک کی درخواست پر ایک رات کے لئے میہنڈو میں ٹھہر گئے تھے۔ یہ گاؤں شریفہ آباد سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر لب سڑک واقع تھا اور یہاں جاٹوں نے حال ہی میں مشترکہ چندے سے ایک عالی شان پاٹ شالہ گئو رکھشا کے لئے تعمیر کیا تھا۔ جلال الدین کمیٹی کی انتظامیہ کے اعلیٰ رکن تھا۔ اُسی کو استقبالیہ کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔ گاندھی جی نے پاٹ شالہ میں ٹھہرنے سے صاف انکار کر دیا اور اُنھوں نے اپنی کٹیا اچھوتوں کی گلی کے پاس کھڑی کرنے کا حکم دیا۔ مولوی جلال ساری رات گاندھی جی کے پاس بیٹھا ہوا اُن کی پیاری پیاری رسیلی باتیں سنتا رہا تھا اور اپنے نئے نئے تصوّف کے سہارے اس منحنی سے ننگ دھڑنگ آدمی کی اُس روحانی طاقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا جس نے اُسے مسٹر سے مہاتما بنا دیا تھا۔ اُن دنوں بھی کافی عرصہ سے بارش نہ ہوئی تھی اور خاص طور پر نہ جانے کس طرح وہ کنواں بالکل خشک ہو گیا تھا جو گاندھی جی کی کٹیا سے ذرا پرے برگد کے اُس درخت کے نیچے بنا ہوا

تھا جس پر ہر وقت سینکڑوں بندروں کا ڈیرہ رہتا تھا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح چند جاٹوں نے کنوئیں میں پانی دیکھا تو شور مچاتے ہوئے گاندھی جی کے پاس آئے اور پاؤں چھو کر اُنھوں نے کہا "مہاتما جی! ہم پانی کی ایک ایک بُوند کو ترس رہے تھے۔ کل رات تک کنواں سوکھا ہوا تھا۔ اس دھرتی پر آپ کے چرنوں کے آتے ہی پانی آ گیا۔" گاندھی جی نے جواب دیا تھا "ارے بے وقوفو! پانی کا میرے یہاں آنے سے کیا تعلق؟" مولوی جلال الدین نے اس سیدھے سادے فقرے کا مطلب بھی اُلٹا ہی سمجھا تھا اور یوں جانا تھا کہ کنوئیں میں پانی کا آنا اصل میں مہاتما کا فیضان ہے۔

مرشد سدھار گئے تھے لیکن مرید اپنا نفس قدرت کے نفس میں جذب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گرو چل بسا تھا لیکن چیلا آسمان سے پانی نچوڑنے کے لئے اپنے آپ کو نچوڑ رہا تھا۔ سو برس کا بڈھا بھی اگر مافوق الفطریت کا سہارا نہ ڈھونڈے تو وہ احمق ہے اور اس کی تو ساری عمر روحانیت ہی کی چار دیواری میں بسر ہوئی تھی، حتیٰ کہ جب وہ اپنی کمر پر کوڑے کھاتا تھا، اُس وقت بھی اُس کے سامنے روح کے اعلیٰ مقاصد رہتے تھے۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے کلمۂ طیّب کا ورد شروع کر دیا۔

خواجہ نے اُسے اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر کے صرف ایک نصیحت کی تھی کہ پانچوں وقت نماز پڑھنے کے بعد ایک سو ایک مرتبہ کلمہ شریف کا ورد کیجئو، کوئی مصیبت تجھے پریشان نہ کرے گی۔ وہ آج تک اس پر برابر عمل کرتا رہا تھا۔ کلمے کا ورد بھی ختم ہو گیا۔ لیکن آسمان نے زمین پر دھوپ برسانا بند نہ کیا۔ اب تو اُسے ایک عجیب مذہبی جھرجھری سی آئی۔ مشکل کشا کی امداد مانگ کر وہ اُٹھا۔ سر پر دوپلی ٹوپی ٹھیک طرح جمائی اور بارش لانے والی نماز کے لئے نیت باندھ کر، سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے دو مرتبہ وہ نماز استسقاد کو شریفہ آباد میں آزما چکا تھا۔ جب بارش نہ ہوتی تھی تو ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا۔ سب بالغ مسلمان اور بچے عید گاہ میں جمع ہو جاتے تھے۔ وہ خود نماز استسقاد پڑھاتا تھا۔ پھر سب گڑگڑا کر بارش کے لئے دُعائیں مانگتے تھے۔ اُسی دن کسی نہ کسی وقت بارش ضرور ہو جاتی تھی اور لوگ شکرانے کی دیگیں چڑھاتے تھے۔ پچھلی فصل پر رننہ کھنہ میں بھی لوگوں نے مولوی جلال الدین کے پیچھے یہ نماز پڑھی تھی، اور سب ٹوٹکے کئے تھے۔ لیکن بادلوں کی صورت تک دکھائی نہ دی تھی اور شکرانے کے گڑ چاول دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ مولوی جلال الدین نے لوگوں سے تو یہ کہا تھا

کہ یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے اور خود اپنے لئے یہ فتویٰ صادر کیا تھا کہ میں ہی کچا ہوں۔ ابھی میرا نفس آلائشوں سے پاک صاف نہیں ہوا۔

اور آج خدا جانے کیوں اُسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اُس کا نفس بالکل پاک صاف ہے، وہ خواجہ اور مشکل کُشا کا دستِ محبت پکڑ کر آسمان پر گھٹا لا سکتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ زندگی میں پہلی بار اُسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے پنڈت نہرو اور گاندھی جی کی پیروی کر کے مذہبی غلطی کی ہے۔ وہ پھر بھی کافر ہیں۔ کوئی ایک گھنٹے تک وہ نیّت باندھے کھڑا ہوا اپنے آپ کو جھلساتا رہا۔ اُس کا ذہن کفر و ایمان کی کشمکش کا مقابلہ کر رہا تھا اور وہ اپنی پوری روحانی توجہ اسی ایک نقطے پر مرکوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ خواجہ بارش مشکل کُشا بارش۔ مگر بارش نہ ہوئی۔ پھر اُس نے ایک اور ہی شخص کو پکارا جس کا تعلق پانی سے براہِ راست تھا۔ "یا حسینؑ! تو بھی تین دن کا پیاسا تھا اور میں بھی تین دن کا پیاسا ہوں۔ میرے ننھے ننھے بچے تڑپ رہے ہیں۔ آخر یہ بھی تو تیری ہی اولاد ہے۔" چند منٹ تک جذب کا سا عالم طاری رہا لیکن وہ اس عجیب و غریب کیفیت کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ اُس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ وہی چلچلاتی ہوئی

تیز دھوپ تھی۔ دہکتا ہوا سورج تھا۔ سوکھے ہوئے بنجر کھیت تھے۔ اس کا کھدر کا میلا کچیلا کرتا پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے چہرے سے پھسل کر سینے پر بندھے ہوئے ہاتھوں پر پڑ رہے تھے۔ اس نے دعا ختم کئے بغیر ہاتھ چھوڑ دیئے۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے اپنے آپ سے کہا "میں ہی کچا ہوں۔ شکر ہے کہ مجھے میری سزا اسی زندگی میں مل رہی ہے۔"

اس فریب وہ تسکین کے باوجود تشنہ اور انتقام کا ناآسودہ اور غیر استعمال شدہ جذبہ اپنی راہ نکالے بغیر نہ رہ سکا۔ دانت کچکچا کر آسمان کی طرف گھورنے لگا۔ مٹھیاں بھینچ کر وہ چیخا "میں انتقام لوں گا اے خدا تجھ سے انتقام لوں گا۔" اسی لمحاتی جھلاہٹ میں وہ تسبیح، جسے وہ دونوں ہاتھوں میں تھامے کھڑا تھا، ٹوٹ کر دانہ دانہ ہو گئی۔ اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا جھریوں پڑے کلوں کو تھپتھپایا کہ کئی بار دعائے استغفار پڑھی۔ خدا سے گڑگڑا کر اپنے آخری گناہ کی معافی مانگی اور بڑی عاجزی سے زمین پر بیٹھ کر رعشہ زدہ ہاتھوں سے تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے ڈھونڈنے لگا۔

تسبیح کا ایک ایک دانہ وہ بڑے مقدس انداز میں چوم چوم کر جیب

میں رکھ رہا تھا۔ ایک ایک دانے کے ساتھ اُس کی پچھلی زندگی کی نیکیوں کا طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ سیاست اور مذہب الگ الگ ہو رہے تھے۔ وہ اپنے تمام افعال کو کفر کے مترادف سمجھنے لگا۔ دفعتہً ماضی کا ایک بھولا بسرا واقعہ یوں اُبھرا جیسے وہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا گناہ ہو، جیسے اسی ایک واقعہ کی بنا پر اسے جنت یا دوزخ میں بھیجے جانے کا فیصلہ ہو گا۔ سن اڑتیس کی شریفہ آباد کی سیاسی فضا کی ایک ایک تصویر اس کی آنکھوں میں گھومنے لگی ....

۳۷ء کی کانگرسی وزارتوں کے زمانے میں مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ہوئے تھے اُن کی بنا پر مسلمانوں کے دلوں میں کانگرس کے خلاف شکوک و شبہات کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ مسلم لیگ کو موقع ہاتھ آ گیا، اُس نے نعرہ بلند کیا کہ ہم جو اتنے عرصہ سے چیخ رہے ہیں کہ کانگرس مسلمانوں کی وفادار نہیں ہے تو ہماری بات کوئی نہیں سنتا تھا۔ یاد رکھو کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ علامہ اقبال نے پہلے ہی الٰہ آباد کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں واشگاف الفاظ میں ہندوستان میں ایک علیحدہ اسلامی ریاست کا مطالبہ کر دیا تھا۔ ہندوستان کی تمام سیاسی سرگرمیوں کا قلب دلّی تھا

اور شریفہ آباد قلب کے پہلو میں جگر کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ دہلی اور یو پی کو پنجاب سے ملاتا تھا۔ دہلی کی زندگی کی معمولی سی جنبش بھی شریفہ آباد میں محسوس ہو سکتی تھی۔ ایک تو کانگرسی وزارتوں کے عہدِ حکومت میں فرقہ وارانہ فسادات کثرت سے ہوئے، اکثر مقامات پر قرآن مجید کی بے حرمتی کی گئی، اردو زبان اور گئو کشی کی وجہ سے بھی جگہ جگہ مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ دوسرے یہ ہوا کہ خاص شہر دہلی میں کمپنی باغ کی مسجد پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں ویسا ہی جھگڑا شروع ہو گیا جیسا لاہور میں مسجد شہید گنج کی ملکیت پر ہوا تھا۔ ان سارے واقعات کا اثر شریفہ آباد پر بھی پڑ رہا تھا۔ قصبہ کی پانچ ہزار آبادی میں تین ہزار مسلمان اور باقی ہندو تھے۔ دُور دُور تک مسلم آبادی کا کوئی گاؤں یا قصبہ موجود نہ تھا۔ مغرب میں بیس میل پر روہتک، شمال میں دس میل پر سونی پت، مشرق میں بائیس میل پر دہلی اور جنوب میں اٹھارہ میل پر بہادر گڈھ واقع تھے، جہاں رومی ٹوپیاں، تھرکتے ہوئے پھندنے، اچکنیں، شلواریں اور پاجامے نظر آتے تھے۔ ان نقطوں کو ملانے سے جو دائرہ بنتا ہے، اُس کا مرکز شریفہ آباد تھا اور پورے دائرے میں تقریباً پچاس مواضعات تھے جن کی سو فی صد آبادی ہندو جاٹوں پر مشتمل تھی۔ ۱۹۳۸ء میں بقرعید سے چند روز پیشتر جاٹوں

نے موضع سسسانہ میں ایک خفیہ جلسہ منعقد کر کے طے کیا کہ اس سال شریفہ آباد
میں گئو ماتا کی قربانی دی گئی تو پچاس دیہات مل کر اس پر حملہ کریں گے۔
ماسٹر شفاعت علی جو سسسانہ کے مڈل سکول میں چھٹی جماعت کو پڑھایا
کرتا تھا اور شریفہ آباد کا رہنے والا تھا، اتفاق سے اس روز وہیں تھا۔ اُس نے
شریفہ آباد آکر مولوی جلال الدین کو جلسے کی ساری کارروائی سے آگاہ کر دیا۔
مولوی صاحب کو بہت طیش آیا۔ اُن دنوں وہ ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی کے
سیکرٹری تھے۔ اُنھوں نے بقرعید سے ایک روز پہلے شریفہ آباد کے
ہندو مسلم معززین کو پنچایت گھر میں بلایا اور کہا اگر اس سال قربانی نہ دی جائے
تو بہتر ہے۔ ہاشم علی جذبے میں آگیا۔ بولا "دُنیا کی کوئی طاقت ہمیں قربانی سے
نہیں روک سکتی۔"
میر حشمت علی رئیس اعظم فی الحال مولوی جلال کی حمایت پر اُتر آئے۔
"قربانی سے تو ہمیں کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ لیکن ہاشم علی تُو اتنا سمجھدار ہو گیا
ہے، سوچ تو سہی جھگڑے میں کیا رکھا ہے۔"
رفیق قصائی ہاشم علی کی تائید کرنے لگا "میر صاحب! ہم قربانی کریں گے
ضرور کریں گے۔ کسی اور سال کریں یا نہ کریں، اب کے ضرور کریں گے۔ یُوں ہے

تو یوں ہی سہی۔"

مولوی جلال الدین نے رفیق قصائی کی طرف شفقت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔"بیٹا جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔قربانی تو ہمارا مذہب ہے۔حلال جانوروں کا گوشت کھانا ہمارا ایمان ہے، لیکن اگر کچھ عرصہ ہم گوشت نہ کھائیں گے تو ایمان میں فرق نہ آجائے گا۔"

معززین کے سمجھانے بجھانے پر پنچایت نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا کہ اب کے صرف بکروں کی قربانی ہو گی، لیکن کچھ حاضرین نے پنچایت کا یہ فیصلہ دل سے قبول نہ کیا تھا۔شیخ جمشید علی ایک کایاں آدمی تھا۔گھوڑی پر چڑھ کر فوراً مسانہ پہنچا۔اُس وقت وہاں پچاس کے خاص خاص آدمیوں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔جمشید علی گھوڑی نیم سے باندھ کر چوپال میں داخل ہوا۔اور جاتے ہی جاٹوں کے حقے کی نے اپنی طرف کر کے دو تین گھونٹ اُوپر تلے چڑھا گیا۔جاٹ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے کہ یہ کیا ہوا، حقہ ناپاک ہو گیا۔جمشید علی نے بڑے مؤثر لہجے میں ایک تقریر سی کر ڈالی۔"ارے بھائیو! کچھ پتا بھی ہے، کیا ہو گیا ہے۔شریف آباد نے اب کے تمہارے ایک ایک گاؤں کے نام پر ایک ایک گائے ذبح کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔پچاس گائیں قربان ہوں گی رے

پچاس۔ تم سمجھتے کیوں نہیں رہے، میں تو ہندو ہوں ہندو۔ میر صاحبوں کی چھوریاں اپنے تلے سے نہ نکالیں تو جاٹ کا نہیں، کسی چوہڑے چمار کا کہلاؤں۔ اگر تمھیں یقین نہیں آتا کہ میں جنم کا ہندو ہوں تو پھر آج اپنے بھائیوں کے پاس آیا ہوں۔ تم جو چاہو میرا نام رکھ دو۔ اپنے بال بچّوں کو بھی ہندو بناؤں گا۔ تم ایک اچھا سا مکان میرے لئے بنوا دو، میں سب کو یہیں لے آؤں گا۔ گئو ماتا کی سوں، میں شریفہ آباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

پچاسے کی میٹنگ نے جمشید علی کا نیا نام "چودھری بھوپ سنگھ" رکھ دیا جمشید علی کو گئو کشی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ سخت مکّار آدمی تھا۔ ساری عمر عیّارانہ چالوں میں گزری تھی۔ اُس کی ساری زمینیں فروخت ہو چکی تھیں اور اب وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو رہا تھا۔ روپیہ کمانے کا اُس نے یہ ایک نیا ڈھنگ نکالا تھا۔

اُدھر شریفہ آباد کے بنجارے اور قصائی اور شیخ حمید جو ڈنگروں کا بیوپار کرتا تھا، راتوں رات منڈلی بنا کر مٹینڈو پہنچے اور رپاٹ شالہ کے ملبے چوڑے صحن سے چودہ رانی گائیں چُرا لائے۔ حالانکہ جاٹوں نے سخت پہرہ

لگایا ہُوا تھا۔

دوسرے دن بستی سے باہر عیدگاہ میں مولوی حافظ سیّد جلال الدین سرپہ پگڑی باندھے قربانی کے فلسفۂ عظیم پر وعظ دے رہے تھے۔ اُنھیں اُن کارروائیوں کا علم نہیں تھا جو پنچایت کے فیصلہ کے بعد دو مختلف پارٹیوں نے انجام دی تھیں۔ وہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے اور اسی لیے اُنھوں نے کانگرس کی ڈسٹرکٹ کمیٹی کو اطلاع نہ دی تھی۔

پہلی رکعت کے بعد مولوی جلال "اللہ اکبر" کہہ کر دوسری رکعت پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو عیدگاہ کے پیچھے سے نعروں کی آوازیں آرہی تھیں "گئو ماتا کی جے"۔ "چودھری بھوپ سنگھ کی جے"۔ "پچاسے کے سردار کی جے"۔ عیدگاہ کی فصیل پر بیٹھے ہوئے، نئے نئے کپڑوں میں ملبوس ننھے ننھے بچّوں نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ شرفو بنجارے نے ہاتھ چھوڑ کر باوازِ بلند نعرہ لگایا۔ "نعرۂ تکبیر" چند قریبی لوگوں نے نیّت باندھے جواب دیا۔ "اللہ اکبر"۔ افراتفری مچ گئی۔ لوگ نیّت توڑ کر نعرۂ تکبیر کا جواب دینے میں شریک ہو گئے۔ چاروں طرف سے ہزاروں جاٹ لاٹھیاں، جیلیاں اور گنڈاسے لیے عیدگاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مولوی جلال الدین نے منبر پہ

چڑھ کر کہا "مسلمانو! انھیں مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے ربّ غفور کی بارگاہ میں خلوصِ قلب کے ساتھ سجدے ادا کرتے رہو۔ اگر وہ تمھیں سجدے میں قتل کر دیں گے تو یہ شہادت ہوگی اور آج کے دن حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی یاد میں یہ سعادت کسے نصیب۔"

عدم تشدد کی عادت اپنی چال چل گئی تھی۔ سارے مسلمان اپنی اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ جاٹ عیدگاہ کے بالکل قریب آگئے تھے۔ مولوی جلال الدین نے مسلمانوں سے کہا "آپ لوگ اطمینان سے بیٹھے رہیئے۔ میں انھیں جا کر سمجھاتا ہوں اور واپس بھیجتا ہوں۔"

مولوی صاحب عیدگاہ سے نکلے اور بڑی تمکنت سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قبرستان تک آگئے جہاں جاٹ کھڑے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے جاٹوں سے کہا "بھائیو! پنچایت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ اس سال قربانی نہ ہوگی۔"

ایک جاٹ نے آگے بڑھ کر کہا "اور وہ جو ہرانی گائیں لائی گئی ہیں یہاں۔"

"کہاں؟"

اُسی جاٹ نے مولوی صاحب کو جواب میں ایک فحش گالی دی۔ مولوی صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا "بھائیو! تم نہیں جانتے کہ تمہاری اس حرکت سے کیا نتائج برآمد ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔"

ایک اور بلیے تڑنگے جاٹ نے ہجوم سے باہر نکل کر لاٹھی اُن کے کندھے پر جڑ دی "او تیرے نتائج کی ماں کا ۔ ۔ ۔ ۔"

کئی جاٹ مولوی صاحب پر ٹوٹ پڑے۔ خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ اُدھر عیدگاہ سے مسلمان 'اللہ اکبر' کے نعرے لگاتے ہوئے آن پہنچے۔ چار پانچ بنجارے احتیاطاً اپنے ساتھ لاٹھیاں لے آئے تھے، اُنھوں نے جاٹوں پر وہ لاٹھی چلائی اور ایسے آڑے ترچھے پینترے دکھائے کہ بھگدڑ مچ گئی۔ ہجوم کی چال کو بھیڑ چال سے تشبیہ دی جاتی ہے، ایک جاٹ نے پیٹھ دکھائی، سب اُس کے پیچھے بھاگتے چلے گئے۔

اس واقعہ کے بعد حالات بگڑتے چلے گئے۔ مولوی جلال الدین کو روہتک کے سرکاری ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا؛ جہاں دو ماہ تک اُن کے زخموں پر پٹیاں بندھی رہیں۔ کانگریس کمیٹی کا ایک خاص اجلاس ہوا اور اس افسوسناک واقعہ کی دل کھول کر مذمت کی گئی۔ کمیٹی کی درخواست پر

ایک پولیس چوکی شریفہ آباد میں قائم کر دی گئی۔ اُدھر پچلیسے نے اپنے سردار چودھری بھوپ سنگھ کی صدارت میں دو فیصلے کئے :

(۱) شریفہ آباد کے مسلمانوں کا معاشری بائیکاٹ۔ اُن کی زمینیں باہنا جُرم۔

(۲) شریفہ آباد سے چاروں طرف جانے والی سڑکوں پر مسلمانوں کی ہر قسم کی آمد و رفت بند۔

اس تحریک کا نام ہوتے ہوتے "بائیکاٹ" پڑ گیا۔ پُورے علاقے کی زمینوں کے مالک شریفہ آباد کے مُسلمان تھے اور کاشت کاری جاٹ کرتے تھے۔ بائیکاٹ برابر ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ دو ہی فصلوں کے بعد مسلمان بھوکے مرنے لگے۔ زمینیں بنجر ہو گئیں۔ بیس پچیس دکانیں جو چھوٹے بازار میں غیر زمیندار مسلمان کھولے بیٹھے تھے، بند ہو گئیں کیونکہ آمد و رفت کے تمام سلسلے بند تھے۔ بائیکاٹ نے شدت اُس وقت پکڑی جب حنیف ڈرائیور کو، جو ہریانہ ٹرانسپورٹ کمپنی کی ایک لاری روزانہ شریفہ آباد سے دہلی لے جایا کرتا تھا، قتل کر دیا گیا۔ دوسرے دن ماسٹر شفاعت علی سسانے میں ڈھیر ہو گئے۔ پچاسہ ہر تیسری رات شریفہ آباد

پر حملہ بول دیتا تھا اور ایک آدھ جان لے کر جاتا تھا۔ رات دن مردوں اور عورتوں پر حملے کی دہشت طاری رہتی تھی۔ مسلمانوں کے بچوں نے سکول جانا چھوڑ دیا۔ کیونکہ کُل آٹھ سو لڑکوں میں سے بمشکل پچاس طالب علم مسلمان تھے۔ مولوی جلال الدین چونکہ قصبہ کے سب سے معمر اور سیاسی کاموں کی وجہ سے سب سے معزز آدمی سمجھے جاتے تھے، اس لئے سب سے زیادہ ذمہ داری خود بخود اُنہی پر آ گئی تھی۔ زندگی کے یہ ایام اُن کے لئے سخت کٹھن تھے۔ تھانے دار ہر معاملے میں اُنہی سے مشورہ کرتا تھا، اور وہ خود ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حمایتی تھے۔ ہندوؤں نے بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ وہ خود مسلمان تھے غیر جانب دار رہتے ہوئے مسلمان رہنا اُن کے لئے عذاب ہو گیا تھا۔ آخر اُن کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ وہ کانگریس کمیٹی کے ایک رُکن لالہ ٹیکا رام کو رہتاس بھیجنے کی ترغیب دلانے میں کامیاب بھی ہو گئے ٹیکا رام اُن کا ایک ذاتی رقعہ بھولا ناتھ صدر ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے نام لے گیا۔ بھولا ناتھ نے ڈپٹی کمشنر علاؤ الدین کو پکڑا اور دونوں شریف آباد پہنچے۔ فریقین کے نمائندوں کو طلب کیا گیا۔ مسلمان معززین نے مولوی جلال سے نمائندگی کرنے کے لئے کہا، لیکن اُنھوں نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا۔

"میری پوزیشن بڑی نازک ہے۔" چنانچہ مسلمانوں کی نمائندگی میر حشمت علی نے اور جاٹوں کی نمائندگی چودھری بھوپ سنگھ نے کی۔ میر حشمت علی نے کہا، "قربانی ہر قیمت پر ہوگی، یہ ہمارا مذہب ہے۔" چودھری بھوپ سنگھ نے کہا۔ "قربانی کسی قیمت پر نہ ہوگی، یہ ہمارا مذہب ہے۔" مولوی جلال الدین کی رائے پوچھی گئی تو اُنھوں نے آل انڈیا کانگریس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مصالحانہ انداز اختیار کیا۔ کہنے لگے۔ "قربانی دینا عین اسلام ہے لیکن اگر ہمارے بھائی نہیں چاہتے تو ہمیں گائے کی قربانی نہیں کرنی چاہیئے۔"

ڈپٹی کمشنر کو یہ رائے بہت پسند آئی۔ اپنی کالی عینک آنکھوں سے اتار کر میز پر رکھتے ہوئے اُس نے تعریف بھی کر ڈالی۔ "مناسب ہے مناسب ہے۔"

لیکن چودھری بھوپ سنگھ گرجا۔ "گائے کی قربانی کیا — اب ہم بکروں کی قربانی بھی نہ ہونے دیں گے۔"

میر حشمت علی نے کہا۔ "اب ہم گایوں کی قربانی بھی کریں گے۔"

منشی شجاعت علی نے کہا۔ "علی الاعلان کریں گے۔"

مولوی جلال الدین نے کہا۔ "آپ کہتے ہیں تو ہم بکروں کی قربانی

بھی نہ کریں گے ۔"

. . . . اور آج مولوی جلال الدین اپنے آپ پر لعنت ملامت کر رہا تھا کہ اُس نے یہ غیر اسلامی بات کیوں کی تھی۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا "جلال، تیرا ٹھکانہ دوزخ ہے دوزخ ۔" وہ سوچنے لگا کہ اُس وقت میں پاگل ہو گیا تھا، یا میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا، آخر کیا ہو گیا تھا۔ مجھ سے تو اچھا بھوپ سنگھ ہی تھا جو دو ٹوک بات کر رہا تھا۔ جس کا ظاہر باطن ایک تھا۔ میں دل سے قربانی کو مانتا تھا، قربانی کے فلسفے پر خطبہ دیتا تھا، اور زبان سے یہ کہتا تھا کہ قربانی نہیں ہونی چاہیئے ۔ ایسا کیوں تھا ۔؟ جلال! جواب کیوں نہیں دیتا؟ ایسا کیوں تھا؟ . . . مناسب جواب نہ پاکر وہ مزید جھلا گیا تھا اور تسبیح کے ڈھونڈے ہوئے چند دانے چوم کر جیب میں ڈال لیئے۔ سر سے دو پلی ٹوپی اتار کر اُس سے چہرے کا پسینہ خشک کیا اور دوبارہ دانے ڈھونڈنے سے پہلے باآواز بلند کہا "اللہ میاں! تُو بڑا بے نیاز ہے، مجھے معاف کر دیجیو میرے اللہ، میں تیرا گنہگار بندہ ہوں۔ پر تیری رحمت میرے گناہوں سے بھی بڑی ہے ۔"

ڈپٹی کمشنر اپنی دانست میں مصالحت کرا کے چلا گیا تھا، لیکن چند روز بعد

حالات زیادہ دگرگوں ہو گئے۔ مولوی جلال نے کانگرس ہائی کمان کو حرکت دی۔ کانگرس نے یونینیسٹ وزارت کو شرم دلائی۔ وزیرِ اعلیٰ سر سکندر حیات خاں اور وزیر ریونیو سر چھوٹو رام بہ نفسِ نفیس شریفہ آباد تشریف لائے چھوٹو رام نے تو شریفہ آباد کے مڈل اسکول میں آٹھویں جماعت تک تعلیم پائی تھی۔ وہ شریفہ آباد سے چار میل کے فاصلے پر ایک ایسے چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے تھے جہاں کے بچے شریفہ آباد سکول میں پڑھنے آتے تھے۔ مولوی جلال عجب مخمصے میں گرفتار تھے۔ وہ ایک ایک مسلمان سے مل کر فی الحال قربانی نہ کرنے پر راغب کر رہے تھے، لیکن بنجارے اور قصائی بلاناغہ ایک رانی گائے، جو جاٹوں نے مقدس کر کے جنگل میں چھوڑی ہوتی، پکڑ لاتے تھے اور روزانہ شریفہ آباد میں کچھ ہو نہ ہو، گائے کی قربانی ضرور ہو رہی تھی۔ آخر مسلمانوں نے متفقہ فیصلہ کر کے ایک دن مولوی صاحب کو مسجد کی امامت سے برطرف کر دیا۔ اُن کا حقہ پانی بھی بند کر دیا گیا۔ اولاد بھی اُن سے خفا ہو گئی۔ بیٹے پوتے بڑھ چڑھ کر بائیکاٹ میں حصہ لے رہے تھے اور جب ہر تیسری رات جاٹ حملہ کرتے تھے تو وہ سب سے پہلے پگڑی باندھ کر لاٹھیاں سنبھال کر مقابلہ کرنے نکلتے تھے۔

دوسرے سال محرم کی دسویں تاریخ کو تو بیٹوں نے اپنے باپ اور پوتوں نے اپنے دادا کو گھر کی سب سے چھوٹی اور اندھیری کوٹھڑی میں رسیوں سے باندھ دیا تھا تاکہ وہ مسلمانوں کو لڑائی سے نہ روک سکے۔ دن کے دس بج گئے تھے لیکن ابھی تک تعزیے نہ اُٹھے تھے۔ چودھری بھوپ سنگھ کے ہاں پندرہ روز پہلے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کا نام سیتا رکھا گیا تھا۔ اس کی ننھیال کی طرف سے اس کا کرتا ٹوپی بڑے اہتمام سے آرہا تھا۔ شریف آباد کے چاروں طرف سے پورا پیچاسہ پوری جنگی تیاریوں کے ساتھ آیا تھا۔

مسلمانوں کو اُن کی تیاریوں کا علم تو نہ تھا، مگر یہ ضرور معلوم ہوگیا تھا کہ پیچاسہ شریف آباد پر چڑھا کھڑا ہے اور آج ضرور کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ پولیس کی نفری پچھلے برسوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ آئی تھی۔ تھانیدار کے کہنے پر تعزیوں کو حکم دیا گیا۔ سوز خوانی شروع ہوئی۔ میر حشمت علی، میر رشید احمد، شیخ فضل الٰہی اور مرزا شہریار بیگ نے ایک ایک ماتمی کو سمجھا دیا تھا کہ بہر حال چپ چاپ گزرنا ہے، کسی کو نہ چھیڑنا خواہ وہ تمہیں کچھ بھی کہے۔ تعزیے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے بڑے

بازار میں آ گئے۔ اُدھر سے جاٹوں کا جلوس بڑھا آ رہا تھا۔ پچاس جاٹ پچاس گھوڑیوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ ہر گاؤں کی طرف سے ایک گھوڑی پیش کی گئی تھی۔ گھوڑیاں اعلیٰ نسل کی تھیں اور خوب سجی ہوئی تھیں۔ سوار بھی منتخب تھے، گبرو جوان۔ پیدل لوگوں میں سے ہر پانچویں شخص کے سر پہ سینا کا ہندوانہ طرز کا سلا ہوا کرتا ٹوپی رکھا ہوا تھا۔ پچاس دیہات کے ہر گھر نے ایک جوڑا دیا تھا۔ جب جلوس اور قریب آیا تو منشی شجاعت علی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں متنبہ کر دیا۔ منشی جی نے لاکھ چاہا کہ مرثیہ خواں اپنی آواز مدھم کر دیں، سینہ کوبی کی آوازیں کم ہو جائیں، لیکن جُوں جُوں جلوس قریب سے قریب تر آ رہا تھا، ماتمیوں کا جوش بڑھ رہا تھا۔ آنکھیں جلوس کی گھوڑیوں پر گڑی ہوئی تھیں اور ہاتھ زیادہ زور سے چھاتی کُوٹ رہے تھے۔ اور یُوں ہزاروں آوازیں یک آواز ہو کر ایک گونجتا ہُوا نعرہ بن رہی تھیں۔ گھوڑیاں بالکل قریب آ گئی تھیں۔ سب سے اگلی گھوڑی کا منہ اُس رستے سے لگنے لگا جو ماتمیوں کے گرد اگرد محض تنظیمی سہولتوں کی خاطر ہر سال تنا جاتا تھا۔ گھوڑی کے سوار نے ایک بچّہ سے کہا۔ "یہ رسّہ ہٹا دے۔"

بچّہ تُنک کر بولا۔ "نہیں ہٹاتا۔"

کچھ لوگ جو ماتم نہیں کر رہے تھے، آگے بڑھ کر سوار کے پاس پہنچے

"کیا بات ہے؟"

سوار نے کہا "بات کی آنکھ میں ہاتھی۔ رستہ ہٹاؤ رستہ۔"

بھومن بنجارہ لوگوں کو چیرتا ہوا آگے آ گیا "رستہ نہیں ہٹے گا۔"

"تو پھر ہم کہاں سے جائیں۔"

بھومن بولا "اپنی ماں کے . . . سے جاؤ اور کہاں سے جاؤ گے"

دوسرا سوار آگے بڑھا "اوئے تیری بہن کی . . . رستہ ہٹاتا ہے کہ نہیں۔"

بھومن کے چھوٹے بھائی جگن نے پیچھے سے گنڈے دار لاٹھی اس زور سے اُس کے سر پر ماری کہ وہ چکرا کر گھوڑی سے گر کر زمین پر آ رہا۔ لگام ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گھوڑی پیچھے ہٹی اور کد کڑے مارتی بھاگنے لگی۔ کڑا کڑ لاٹھیاں بجنے لگیں۔ گولیوں کی خوفناک آوازیں ہوا میں پھڑپھڑانے لگیں۔ "گئو ماتا کی جے" اور "اللہ اکبر" کے نعرے شریف آباد کی گلیوں کے اوپر سے ہو کر جنگلوں کی طرف جاتے ہوئے لگ رہے تھے۔

عورتیں دالان میں کھڑی رو رہی تھیں۔ کوئی مشکل کشا کو پکار رہی تھی۔

کوئی مسجد ے میں پڑی تھی، کسی کی گھگی بندھی ہوئی تھی اور کسی کی ہچکیاں۔ ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر مولوی جلال الدین اندر کوٹھڑی میں، رسیوں میں جکڑا ہوا چیخ رہا تھا۔ "اری نصیبن، خدا کے واسطے مجھے کھول دے۔ اری او بلقیس! کلم بخت کھول دے مجھے"۔ بیٹیاں، پوتیاں اور نواسیاں کوٹھڑی میں دوڑیں نصیبن رسیاں کھولتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی "ارے بابا، میں تو لٹ گئی رے، سارا گھرانہ لام پہ چڑھ گیا رے بابا"

مولوی جلال بپھرے ہوئے شیر کی طرح بھاگتا ہوا، پتلی پتلی گلیوں میں سے ہوتا ہوا چھوٹے بازار میں آیا۔ بازار کے سرے پر اس کا ایک بیٹا جاٹوں کے نرغے میں پھنسا ہوا تھا۔ مولوی خالی ہاتھ تھا، پھر بھی اسے اپنے کانگرسی ہونے پر اعتماد تھا، لپک کر جاٹوں کے پاس پہنچا اور بیٹے کو چھڑانے لگا۔ ایک جاٹ کی لکڑی پکڑ کر بولا "تجھے پرماتما کی سوں، جو اب مارا ہو گا۔"

دوسرے جاٹ نے لاٹھی گھمائی تو مولوی چیخا "ارے رے، کیا غضب کرے ہے"۔ لیکن لاٹھی اس کا سر پھاڑ گئی۔ دوسرے جاٹوں نے مل جل کر مولوی کو ڈھیر کر دیا۔ شام کے وقت پولیس نے بیچ بچ سنجیدگی

سے حصہ لے کر جاٹوں کو شریف آباد کی حدود سے نکال دیا۔ مولوی جلال کے گھر میں پانچ لاشیں لائی گئیں۔ دو بیٹے، دو پوتے اور ایک نواسہ کہرام مچ گیا۔ سارا شریف آباد اُن کے گھر میں جمع ہو گیا۔ صفِ ماتم بچھ گئی۔ لاشیں صحن میں رکھی ہوئی تھیں۔ باری باری ایک، ایک لاش کو غسل دیا جا رہا تھا اور کفن پہنایا جا رہا تھا۔ مولوی جنازوں کے قریب ہی ایک اور چارپائی پر قریب المرگ حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ اُس کا سر پھٹ گیا تھا۔ جسم کے کئی حصوں پر سخت چوٹیں آئی تھیں، جن سے اب تک خون بہہ رہا تھا۔ مولوی صاحب کبھی تڑپ کر اپنی گردن جنازوں کی طرف پھیر لیتے، کبھی دالان میں بین کرتی ہوئی عورتوں کی طرف تکنے لگتے۔ دیکھتے دیکھتے اُن کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ برادری کو خود اُن کا فکر لگا ہوا تھا۔ کئی بزرگوں کی آنکھیں برابر اُن پر لگی ہوئی تھیں کہ خدا نخواستہ کہیں یہ بھی سدھار نہ جائیں۔ لوگوں نے اُن کی چارپائی کو اندر لے جانا چاہا لیکن اُنھوں نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ میں خود اپنی آنکھوں سے اپنے بیٹوں کو کفن پہنتے، دولھا بنتے دیکھوں گا۔

تجہیز و تکفین کے بعد رات ہی کو اُن پانچوں کو قبرستان میں دفنا یا گیا۔ مولوی صاحب جنازوں میں شرکت نہ کر سکے۔

کوئی ایک ہفتہ بعد شفیع جرّاح صحن میں بیٹھا ہوا اُن کے زخموں پر مرہم لگانے کے بعد پٹی باندھ رہا تھا۔ ڈاکیہ نے دروازے پر دستک دی اور ایک لفافہ پھینک گیا۔ شفیع لفافہ اٹھا کر لایا۔ مولوی جلال نے چاک کر کے پڑھنا شروع کیا :-

"مولوی صاحب! آداب عرض!

آج اخبارات میں شریفہ آباد کے حادثہ جانکاہ کی خبریں پڑھ کر مجھے اتنا دُکھ ہوا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ آپ کے بیٹوں کی وفات حسرت آیات پر مجھے سخت صدمہ ہوا ہے۔ خدا آپ کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ انگریزوں سے لڑنا اور اُن سے اپنا حق چھیننا ہمارے لئے آسان تھا لیکن فرقہ وارانہ فسادات اور مذہبی تعصب ایک ایسا نیا زخم ہمارے سینوں پر لگا ہے، جس کا کوئی مرہم ہمارے پاس نہیں ہے پھر بھی کانگرس کو آپ جیسے مخلص، بے غرض اور جانباز رضا کاروں کی ذات پر پُورا پُورا بھروسہ ہے۔ آزادی کے لئے جو قربانیاں آپ کو دینی پڑ رہی ہیں، میں اُن سے بے خبر نہیں ہوں۔ ایک

دن آئے گا کہ آپ اور آپ کی اولاد ان قربانیوں کا انعام حاصل کر سکے گی۔

اخبار میں یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کو بھی چوٹیں آئی ہیں۔ میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ لیکن ایک ضروری کام سے مجھے الہ آباد جانا پڑ رہا ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے اُسی پرانے آنند بھون کے پتے پر جلدی خط لکھیں اور اپنی خیریت سے مطلع کریں فقط

دُعاگو

جواہر لال نہرو"

یوں تو مولوی جلال الدین کو جواہر لال نہرو کے کئی خط مل چکے تھے لیکن یہ خط پہلے خطوط کی نسبت زیادہ طویل اور حوصلہ افزا تھا اور اس میں کانگرس کے تنظیمی امور کے علاوہ کچھ ذاتی باتیں بھی کی گئی تھیں۔ "میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا"۔ "مہربانی فرما کر"۔ "میں آپ کی قربانیوں سے بے خبر نہیں ہوں"۔ مولوی جلال دیر تک ان فقروں کا مزہ محسوس کرتا رہا اور پٹی بندھواتے ہوئے بھی بار بار خط پڑھتا رہا۔ اس خط کا جواب اُس نے آنند بھون کے پتے پر ہی بھیجا تھا۔ اس خط میں اُس نے ایک

ایسا فقرہ بھی لکھ دیا تھا جو اُسے آج تک یاد تھا۔" آزادی، کانگرس اور نہرو کے لئے میں پانچ بیٹے کیا، اپنی ساری اولاد، اپنی ساری جائداد اور اپنی جان تک قربان کرنے میں کوئی دریغ نہ کروں گا"۔ . . .

اُس نے اپنے آپ سے کہا۔" تجھے کیا ہو گیا تھا اُس وقت؟ یقیناً تُو بھٹک گیا تھا"۔ اعتراف کے غصے کی شدت میں وہ تسبیح کے دانے ڈھونڈنے بھول گیا۔ اُس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ ہاتھ خلا میں لٹکے رہ گئے۔ خیالات اپنی اپنی قبروں سے اُٹھ اُٹھ کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔" تجھے دھوکہ دیا گیا ہے جلال قربانی بند کرنے کی حمایت کر کے تُو نے ایک ایسا گناہ کیا تھا جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا، اور گناہ تُو نے اُس وقت بھی کیا تھا جب تُو نے اولاد کو لڑائی سے روکا تھا۔ اچھا یہ تو بتا، تجھے مسجد سے کیوں نکال دیا گیا تھا؟ حقہ پانی بند ہونے کی کیا وجہ تھی؟ صاف ظاہر ہے تُو نے کافروں کا ساتھ دیا تھا۔۔۔" ایک دن آئے گا کہ آپ اور آپ کی اولاد ان قربانیوں کا انعام حاصل کر سکے گی۔" مل تو رہا ہے مجھے اور میری اولاد کو انعام اور کتنا صحیح انعام۔ پانی تو انگریز نے بھی نہ روکا تھا"۔ . . .

ایسے ایسے خیالات کا منوں بوجھ لادے پنڈت نہرو اُٹھا اور پھر کنوئیں کی جلتی ہُوئی مینڈھ پر آ بیٹھا۔ تھیلی کھول کر اُس نے ایک ایک خط نکالا اور پُرزے پُرزے کر کے خشک کنوئیں میں ڈالنے لگا۔ جواہر لال کے خط گاندھی جی کے خط، راج گوپال اچاریہ اور بھولا بھائی ڈیسائی کے خط، اچاریہ کرپلانی اور بابو راجندر پرشاد کے خط، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کے خط، سردار پٹیل اور مولانا آزاد کے خط — "سب نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔" چالیس خطوط، جنھیں وہ سینے سے لگائے پھرتا تھا، اُس نے دل کے وسوسوں کے زیرِ اثر آ کر چاک کر دیئے۔ آخر میں اُس نے آج کا خط بھی پھاڑ دیا جو جواہر لال نہرو کے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے آیا تھا۔

خطوط پھاڑ کر وہ دیر تک کنوئیں میں پڑے ہوئے پُرزوں کو غصے سے گھورتا رہا۔ اُس کا دل غم کے اندھیرے کنوئیں میں ڈُوبا جا رہا تھا۔ وہ شخص جس نے بڑے بڑے حادثوں اور بیٹے پوتوں کی لاشوں پر بھی فخر محسوس کیا تھا آج ذرا ذرا سی باتیں یاد کر کے اپنا دل میلا کر رہا تھا۔ جواہر لال نہرو اور کانگرس کی وہ ادائیں جن پر مر مٹنے کے لئے تیار ہو جاتا تھا، پُر فریب اور مصنوعی

نظر آنے لگیں۔ شیشے میں بال آگیا تھا۔ اعتماد کے نازک ظرف کو ٹھیس پہنچ چکی تھی۔ ایسے ایسے شکوک سر اُٹھا رہے تھے جو اُس نے آج سے پہلے کبھی اپنے دل میں محسوس نہ کئے تھے۔ "سب نے مجھے دھوکہ دیا ہے۔ پنڈت نہرو نے ہم سب کو دھوکہ دیا ہے۔ تو کیا جناح یہ ٹھیک کہتا تھا کہ کانگرس بڑی عیّاری سے ہندو راج کے منصوبے باندھ رہی ہے۔"

جناح کا نام وہ اپنی زبان پر اب بھی برداشت نہ کر سکا۔ ساری عمر اس نے اس نام سے نفرت کی تھی اور وہ اسے 'پرتاپ' اخبار کے ایڈیٹر کی نقل میں "مسٹر جینا" کہا کرتا تھا۔ جواہر لال کے خلاف دل میں ہزاروں وسوسے محسوس کرنے کے باوجود وہ جناح کا طرفدار نہ بن سکا۔ اُس نے شیشم کی ٹیڑھی میڑھی لاٹھی پکڑی اور اُس پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوئے، اُٹھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا "چل پنڈت نہرو چل۔ یہاں کب تک بیٹھا رہے گا"

وہ سناٹے میں آگیا۔ آج اُس نے بھی اپنے آپ کو 'پنڈت نہرو' کہہ دیا تھا۔ بارہ برس سے بچّہ بچّہ اُسے پنڈت نہرو یا پنڈت جی کہتا تھا۔ حتّٰی کہ وہ ڈیڑھ پونے دو سو افراد بھی، جن میں اُس کا اپنا خون تھا، جو شریف آباد سے چل کر یہاں رتہ کھنہ میں آگئے تھے، اُسے پنڈت نہرو ہی کہتے تھے۔ پوتے

پوتیاں، نواسے نواسیاں اور اُن کی اولادیں اُسے پنڈت جی کہہ کر پکارتی تھیں۔ ایک بہو اُس کے آگے روٹی رکھ کر کہتی "پنڈت جی روٹی کھا لو۔" ایک نواسہ عید کے موقع پر پوچھتا "پنڈت جی سفید کھدر کا کرتا پہنو گے یا گیروا۔" نواسی کی نواسی اُس کی لاٹھی پکڑ کر گلی کی کیچڑ سے اُسے بچاتے ہوئے کہتی تھی "پنڈت جی، اِدھر سے چلو، یہاں کیچڑ ہے۔" پٹواری، نمبردار، ڈاکیہ مزارع سب اُسے اسی نام سے پکارتے تھے اور آج اُس نے پہلی مرتبہ خود بھی اپنے آپ کو اسی نام سے یاد کیا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا "واہ رے نہرو، تیرے کارن اپنا نام بدلوایا۔ سیّد سے پنڈت ہو گیا۔ پر تُو نے بڑھاپے میں یہ کیا بدلہ دیا۔"

پنڈت نہرو تو ماضی ہی میں زندہ رہ سکتا تھا۔ اُس دن کی بھولی بسری یادوں میں کھو گیا جب پہلے پہل شریفہ آباد نے اُسے 'پنڈت نہرو' کا خطاب دیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بوجھل بوجھل قدموں سے کانپتی لرزتی ٹانگوں سے نہر کے پل کی طرف چل رہا تھا۔ اُس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں ۱۹۴۶ء کے الیکشن کی یادیں چل رہی تھیں . . . .

یہی گرمیوں کے دن تھے۔ شریفہ آباد کے ڈی بی ہائی سکول کی عمارت

میں دو خیمے لگے ہوئے تھے۔ جہاں آج پیر کے دن شریفیہ آباد کے بالغ رائے دہندگان کے علاوہ اردگرد کے پچیس موضعات کے رائے دہندگان کو بھی ہندوستان کی سیاسی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا پنجاب کی یونینسٹ وزارت نے افسروں اور پولیس کی مدد سے مسلم لیگ کو شکست دلانے کی ٹھانی ہوئی تھی لیکن اُس زمانے میں کچھ کانگریس کی پے درپے سیاسی غلطیوں اور کچھ مسلم لیگ کے دانش مندانہ فیصلوں کے باعث ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی ایک ہی آواز بن گئی تھی۔ "مسلم لیگ کو ووٹ دو"

تین دن پہلے جمعہ کو نواب ممدوٹ، ملک فیروزخاں نون اور میاں افتخارالدین انتخابی دورے پر یہاں پہنچے تھے۔ مسلمانوں کا جلسہ عالمگیر مسجد کے چوک میں منعقد ہوا تھا۔ نواب ممدوٹ نے مسلم لیگی سبز جھنڈے کی پرچم کشائی کی تھی اور مولوی جلال الدین کی جگہ مسجد کے نئے پیش امام حافظ اللہ دیا نابینا نے تلاوتِ قرآن اتنی خوش الحانی سے کی تھی کہ نواب ممدوٹ نے خاص طور پر داد دی تھی۔ شریفیہ آباد کی ہندو آبادی بھی جلسہ دیکھنے آئی تھی۔ لیکن اب فرقہ وارانہ کشیدگی ختم ہوگئی تھی۔ عوام کے ذہنوں میں خود بخود یہ مفاہمت ہوگئی تھی کہ مسلمان مسلم لیگ کے اور ہندو کانگرس کے۔

کانگریس کمیٹی کا مقامی دفتر چوک کے عین سامنے لالہ ٹیکا رام کی دکان کی اوپر والی منزل میں واقع تھا۔ مولوی جلال الدین گیروے رنگ کا کرتا اور پاجامہ، گیروے رنگ کی واسکٹ اور گاندھی ٹوپی پہنے اپنے دفتر کے کٹہرے میں دوسرے کانگریسیوں کے ساتھ کھڑا ہوا جلسہ دیکھ رہا تھا اور بار بار کچھ اس انداز میں سر ہلا رہا تھا کہ جیسے یہ سب ان کا وقتی جوش ہے، جیسے یہ سب ایسی حماقت کر رہے ہیں جن کا خمیازہ صدیوں تک ہمیں بھگتنا پڑے گا۔ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کی تقریروں کے رٹے رٹائے الفاظ مولوی جلال کے خیالات اور اُس کی حرکات بنے ہوئے تھے۔ سارا شریفہ آباد اور خود اُس کی اولاد مسلم لیگ کے جلسے میں شریک تھی اور وہ تنہا مسلمان پنج وقتہ پکا نمازی ہونے کے باوجود کانگریس کے دفتر میں تھا اور اپنے آپ ہی کو صحیح سمجھ رہا تھا۔

ہندو بنئے اور جاٹ کانگریس کے دفتر میں ایک لمبی سفید داڑھی والے شخص کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور تقریر کرتے ہوئے ملک فیروز خاں نون کی طرف دیکھ کر مسکراتے تھے۔ ملک صاحب کی نظریں ہندوؤں کے مسکراتے ہوئے چہروں پر منعکس ہو کر کانگریس کے دفتر پر لہراتے

ہوئے ترنگے جھنڈے کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہاں اُنھوں نے ایک مولوی کو دیکھا تو ایک منٹ کے لئے تقریر کرتے کرتے رُک گئے۔ تمام مسلمانوں کی نگاہیں خود بخود مولوی جلال کی طرف اُٹھ گئیں۔ ملک نون نے سوچا کہ کہہ دوں کہ ایسے ہی کانگرس کے زرخرید مولویوں اور پٹھوؤں کی وجہ سے پاکستان کے قیام میں تاخیر ہو رہی ہے، لیکن ہندو آبادی کے خیال سے ضبط کر گئے۔ البتہ تقریر جاری رکھتے ہوئے اُنھوں نے جوش میں آکر کہا "پڑھو مسلمانو کلمہ طیب لاالہٰ اِلا اللہ"

سب مسلمانوں نے بیک آواز پڑھا "لاالہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ ہندو ہنسنے لگے لیکن جھگڑا نہ کرنے کے خیال سے فوراً ہی خاموش ہو گئے۔

ملک نون نے عوام سے کہا "جن لوگوں کو اس کلمہ پر صحیح اعتقاد ہے، وہ ہاتھ اُٹھا لیں۔"

تمام مسلمانوں نے ہاتھ اُٹھا لئے۔ ملک نون نے کانگرس کے دفتر کی طرف نگاہیں اُٹھا کر دیکھا کہ لمبی سفید ڈاڑھی والے گیروے مولوی نے بھی ہاتھ اُٹھا رکھا ہے اور وہ بڑے اعتماد سے مسکرا رہا ہے۔

ملک نون نے کہا "تو تمھیں اس کلمے کی قسم، مسلم لیگ اگر کعبے کو

بھی اپنا نمائندہ کھڑا کرے تو اُسے ووٹ دینا۔"

مسلمانوں نے جوش میں آکر نعرے لگانے شروع کر دیئے "قائدِ اعظم زندہ باد۔"

"لے کے رہیں گے — پاکستان۔"

"ملک فیروز خاں نون — زندہ باد۔"

"افتخار حسین ممدوٹ — زندہ باد۔"

"میاں افتخار الدین — زندہ باد"

"نعرۂ تکبیر — اللہ اکبر۔"

نعروں کے ساتھ ہی جلسہ ختم ہو گیا اور مسلم لیگی لیڈر اپنی سبز رنگ کی کاریں بیٹھ کر، جس میں مسلم لیگی کاغذی جھنڈے لگے ہوئے تھے، سونی پت چلے گئے۔

اتوار کو سورج نکلتے ہی رام لیلا کے میدان میں ہزاروں جاٹوں اور بنیوں کا جمِ غفیر جمع ہونا شروع ہو گیا۔ دس بجے پنڈت جواہر لال نہرو کو دہلی سے روہتک جاتے ہوئے یہاں دس منٹ کے لئے خطاب کرنے کے لئے ٹھہرنا تھا۔ اُس دن مولوی جلال الدین کا جوش و خروش دیکھنے والا تھا۔

اُس کا حقّہ پانی تو مدّتوں سے بند تھا۔ نماز وہ گھر ہی پر پڑھ لیا کرتا تھا۔ صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے سفید کھدر کا کرتا، پاجامہ اور سفید کھدر کی اچکن پہنی۔ سر پر سفید رنگ کی گاندھی ٹوپی جمائی۔ اُس کے ایک پوتے نے کہا۔ "دادا جی، آپ آج جلسے میں نہ جائیں۔ ورنہ بہت بُرا ہوگا۔"

کہنے لگا۔ "جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا۔"

جب وہ گھر سے نکل کر مغلوں کی گلی میں آیا تو عشرت علی نے کھیلتے ہوئے بچّوں کو اشارہ کر دیا۔ "ابے مولوی جلال جا رہا ہے، گھیر لو اسے نعرہ لگاؤ نعرہ۔"

بچّے مولوی جلال کے پیچھے پڑ گئے۔ "ٹوڈی بچّہ ہائے ہائے۔ مولوی بچّہ، ہائے ہائے۔" چھوٹے بازار سے گزرتے وقت اُسے مسلمان دکانداروں اور گاہکوں کے طنزیہ فقروں اور قہقہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن وہ اپنے مقصد کو صحیح جانتے ہوئے اور اُنھیں آنکھوں ہی آنکھوں میں بے وقوف سمجھتے ہوئے چُپ چاپ گزرتا رہا، حتّٰی کہ جب رفیق قصائی نے اپنی دکان پہ لٹکے ہوئے ننگے بکرے کا سُرخ سُرخ گوشت دکھاتے ہوئے کہا۔ "سیر آدھ سیر لے جاؤ نا مولوی جی، پنڈت نہرو کو کھلا دینا۔" تب بھی وہ خاموش

ہی رہا اور صرف مسکرا کر آگے بڑھتا رہا۔ بڑے بازار میں قدم رکھتے ہی جہاں سے ہندوؤں کی دکانیں شروع تھیں، کچھ جان میں جان آئی۔ اطمینان کا سانس لیا۔ یہاں اُس کا سواگت تالیوں سے کیا گیا۔ دو طرفہ دکانوں پر ہندو دکاندار کھڑے ہو ہو کر اُسے نمستے کہتے تھے اور وہ ہاتھ جوڑ کر جواب دیتا ہوا جلدی جلدی آگے بڑھ رہا تھا۔ پنڈال میں پہنچتے ہی اُس نے اپنے ماتحت رضاکاروں کو کچھ ہدایات دیں "نند لال، تم سٹیج سیکرٹری ہو۔ چندربھان تم بھاگ کر پھولوں کے ہار بنوا لاؤ، اور دو گلدان بھی لیتے آنا۔ اور لکشمی چند تم دھیان سے کھڑے رہنا، کبھی کوئی فسادی جلسے میں نہ گھس آئے۔"

پھر اُس نے لاوڈ سپیکر لگوایا اور ایک دو تین کہہ کر چیک کیا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ لاوڈ سپیکر لگوانے اور چیک کرنے کا تو اُسے بہت ہی شوق تھا۔

دس بج گئے۔ دہلی کی طرف سے ہر آنے والی لاری کا گرد و غبار اُٹھیں پنڈت نہرو کی کار کے دھوکے میں مبتلا کر دیتا تھا۔ مولوی جلال کی ایک آنکھ لالہ ٹیکا رام کی گھڑی پر تھی اور دوسری آنکھ دہلی کی سڑک پر وہاں تک دیکھ رہی تھی، جہاں سے دکھائی دینا بند ہو جاتا تھا۔ گیارہ بج گئے

مایوسیاں چھا گئیں ۔ لوگ جمائیاں لینے لگے ۔ کہیں کہیں سے سیٹیوں کی آوازیں بھی آنے لگیں ۔ سکول کے چند لڑکے بار بار لاؤڈ سپیکر پر آکر قومی نظمیں گا کر چلے جاتے تھے ۔ ٹھیک بارہ بجے دو کالی کالی ، لمبی لمبی کاریں دہلی کی سمت سے آتی ہوئی دکھائی دیں ۔ کاروں پر ترنگی جھنڈیاں دور سے صاف نظر آرہی تھیں ۔ "پنڈت نہرو زندہ باد ۔ سوراج زندہ باد ۔" لوگ کھڑے ہوگئے اور ایک ریلا تو سڑک پر جا پہنچا ۔ مولوی جلال لاؤڈ سپیکر پر لپکا ۔ "بیٹھ جاؤ بھائیو بیٹھ جاؤ ۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہیئے ۔ یہ بدنظمی دیکھ کر پنڈت نہرو کیا کہیں گے ۔"

عوام کسی قدر پر اطمینان ہو گئے تو مولوی لاؤڈ سپیکر نند لال کے سپرد کر کے سڑک پر استقبال کے لئے آگیا ۔ اگلی کار سے سب سے پہلے پنڈت نہرو اُترے ۔ جلال الدین نے آگے بڑھ کر چمکتا ہوا ہار پنڈت جی کے گلے میں ڈال دیا ۔ مصافحہ ہوا ۔ دوسرے رضا کاروں نے پنڈت جی کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا ۔ پنڈت جی غصّے میں بھپر گئے ۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے ہار جھنجھوڑ ڈالے ، پتیاں بکھر گئیں ۔ چہرہ لال ہو گیا "یہ وقت پھولوں کا نہیں ، کانٹوں کا زمانہ ہے ۔" پھر وہ بڑے اضطراب سے

سیٹج کی طرف جلدی جلدی چلنے لگے اور ہاتھ اُٹھا اٹھا کر عوام کے نمسکاروں کا جواب دینے لگے۔

سیٹج پر جاتے ہی اُنھوں نے نند لال کو یہ موقع ہی نہ دیا کہ وہ آج کے پروگراموں کا اعلان کرے، صاحب صدر کا نام تجویز کرے، اور بندے ماترم پڑھنے والے لڑکوں کو بلائے۔ پنڈت نہرو نے غصے میں کہنا شروع کیا "تم لوگ بیٹھتے کیوں نہیں ہو۔" پھر اُنھوں نے میدان کے دوسرے سرے پر شور مچانے والے کچھ لوگوں کی طرف ہاتھ اُٹھاتے ہوئے چیخ کر کہا "تم لوگ بیٹھ جاؤ۔ ورنہ میں تقریر نہ کروں گا اور ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔" لوگ فوراً ہی اطمینان سے بیٹھ گئے تو اُنھوں نے کہا "بھائیو! میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ پروگرام کے قواعد وضوابط کے چکروں میں پڑوں۔ میں آج کے جلسے کے لئے جناب مولوی جلال الدین کا نام تجویز کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ مولوی صاحب گزشتہ نصف صدی سے اس علاقے کی خدمت کتنی بے غرضی اور بے لوثی سے کر رہے ہیں۔" (مولوی صاحب سیٹج پر بیٹھے اپنی جگہ انگشت بدنداں تھے کہ یہ کیا ہوا کمیٹی نے تو بھولا ناتھ کو صدر بنانے کا فیصلہ کیا ہوا تھا) پنڈت نہرو نے لاؤڈ سپیکر پر سے

منہ ہٹا کر مولوی صاحب سے کہا "چاچا جی، جلدی کیجئے نا۔ مجھے فوراً رہتک پہنچنا ہے۔" مولوی صاحب تو چوکڑی بھول گئے۔ پنڈت نہرو نے انھیں چاچا جی کہہ دیا تھا۔ بہر حال جلدی سے اٹھے اور صدر کی کرسی پر آکر براجمان ہوگئے۔ پنڈت نہرو نے اپنے گلے سے چمکتا ہوا ہار اتار کر مولوی صاحب کو پہنا دیا۔ مولوی صاحب مسکرانے لگے۔ فوٹوگرافروں نے اس منظر کی کئی تصویریں اتاریں جو لاہور کے "ملاپ" اور دہلی کے "ہندوستان ٹائمز" اور "تیج" میں شائع ہوئی تھیں۔

یہ مولوی جلال الدین کی زندگی کا خوشگوار ترین واقعہ تھا اور آج تک وہ اس وقت کی سرشاری کو نہ بھولا تھا۔ جب جواہر لال نے اس کے گلے میں اپنا چمکتا ہوا سنہری ہار ڈال دیا تھا۔

نند لال سٹیج سیکرٹری نے آگے بڑھ کر پنڈت نہرو کے کندھے کے اوپر سے لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ نعرہ لگایا "بھارت ماتا کی"

"جے ہو" عوام کا ایک ہی جواب تھا۔

پنڈت نہرو آگ بگولا ہوگئے۔ جھلا کر نند لال سے پوچھنے لگے "آپ

جانتے بھی ہیں کہ بھارت ماتا کیا ہے؟"

نندلال سہم گیا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر میز کے پاس جا بیٹھا۔ پنڈت نہرو نے پھر کہا "آپ وہاں کیوں جا بیٹھے ہیں، بتاتے کیوں نہیں ہیں۔ جب آپ کو معلوم ہی نہیں ہے کہ بھارت ماتا کیا ہے تو نعرے لگانے کی کیا ضرورت ہے"

پھر انھوں نے اپنے آپ کو فائیو ہیں کر کے عوام کو مخاطب کیا "بھائیو! اب نعرے لگانے کا زمانہ گزر گیا ہے۔ اس پورے مجمع میں سے ایک شخص بھی ایسا ہے جو مجھے بھارت ماتا کے معنی بتائے؟"

عوام کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہر شخص حیران و پریشان ہو کر دوسرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس خاموشی سے پنڈت نہرو اور بھی جھلا گئے "میں کہتا ہوں، جس چیز کو تم جانتے نہیں ہو، اس کے نعرے کیوں لگاتے ہو۔ یہاں اور کچھ نہیں تو کم از کم پچیس ہزار آدمی بیٹھے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم میں سے ایک بھی یہ نہیں جانتا کہ بھارت ماتا کیا ہے۔"

مجمع کے عین وسط سے ایک لمبا تڑنگا جاٹ پگڑی سنبھالتا ہوا اٹھا اور وہیں سے چیخ کر بولا "بھارت ماتا یہ دھرتی ہے۔"

پنڈت نہرو نے تھوڑا سا مسکرا کر، مگر اپنے پہلے لہجے کو برقرار رکھتے

ہوئے کہا "کونسی دھرتی ؟ کیا یہ ایک گز کی دھرتی جس پر آپ اس وقت کھڑے ہوئے ہیں یا یہ دھرتی جس پہ یہ جلسہ ہو رہا ہے یا یہ شریفہ آباد کی دھرتی یا آپ کی تحصیل یا ضلع یا صوبہ یا کیا ؟ کونسی دھرتی ؟"

وہ جاٹ خاموش ہو کر مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ پنڈت نہرو نے کہا "میں بتاتا ہوں بھارت ماتا کیا ہے۔ ہندوستان کے تمام پہاڑ جو ہماری حفاظت کرتے ہیں اور مون سون ہواؤں کو روک کر بارش برساتے ہیں۔ تمام دریا گنگا اور جمنا، ستلج اور راوی جو ہمارے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔ تمام لہلہاتے ہوئے کھیت جو ہمیں روٹی دیتے ہیں، تمام ہرے بھرے جنگلات جو ہمیں زندگی دیتے ہیں۔ یہ سب ہمیں دل و جان سے عزیز ہیں۔ لیکن یہ سب چیزیں مل کر بھی بھارت ماتا نہیں ہیں۔ بھارت ماتا کچھ اور ہے بھارت ماتا پہاڑوں، دریاؤں، کھیتوں اور جنگلوں میں دُور دُور تک بسے ہوئے چالیس کروڑ عوام ہیں۔ آپ سب بھارت ماتا کے بیٹے ہیں، گویا آپ خود بھارت ماتا ہیں۔ یہ مولوی جلال الدین بھارت ماتا ہیں۔ پنڈت نہرو بھارت ماتا ہے۔ اس مجمع میں کھڑا ہوا ایک ایک بچہ اور ایک ایک بوڑھا بھارت ماتا ہے۔ اور جب آپ یہ کہتے ہیں کہ بھارت ماتا

کی جے ہو، تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب کی، چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی جے ہو۔"

نند لال میز کے پاس سے اُٹھ کر جلدی سے آیا اور پنڈت نہرو کے کندھے کے اُوپر سے لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ نعرہ لگایا۔" بھارت ماتا کی۔"

"جے ہو۔"

"پنڈت نہرو۔"

"زندہ باد۔"

"مولوی جلال الدین۔"

"زندہ باد۔"

مولوی جلال الدین پہ جو نشہ اس "زندہ باد" نے چڑھا دیا تھا، اُس کا خمار آج ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے تو وہ پچیس ہزار افراد کی اجتماعی آواز "زندہ باد" کی رو میں دوبارہ بہہ گیا، لیکن پھر واپس پلٹ آیا اور اپنے نئے نئے شکوک کے تازہ اور زیادہ قومی سیلاب میں بہہ گیا۔ نواب ممدوٹ، ملک نون اور میاں افتخار الدین کا جمعہ کو آنا، پنڈت نہرو

کا اتوار کو دو گھنٹے دیر سے پہنچنا اور اُس کی اپنی شان میں 'زندہ باد' کے نعرے لگنا تو اُس کے اصل شک کے محض حاشیے تھے جو دل کے کونوں کھدروں سے خوشگوار یادوں کے ساتھ اُبھر اُبھر کر چٹکیاں سی لے کر اُسے بہلا رہے تھے، اصل میں تو وہ پورے خلوص آمیز غم کے ساتھ اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ نہرو کے کارن اُس نے اپنا نام بدلوایا، سید سے پنڈت اور مسلمان سے کافر ہو گیا۔ آخر کیوں؟

وہ دن تو اُس کی زندگی کا سب سے ہولناک دن تھا۔ جب وہ مولوی جی کے بجائے "پنڈت جی" کہلانے لگا تھا۔ پیر کے دن سکول کی عمارت میں دو خیمے آس پاس تنے ہوئے تھے۔ ایک خیمے پر ہندوؤں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ وہ سب کانگریس کے نمائندے کو ووٹ دے رہے تھے۔ شریفیہ آباد اور اردگرد کے موضعات سے آئے ہوئے رائے دہندگان نے مسلم لیگ کے نمائندے راؤ خورشید علی خاں کو ووٹ دیئے۔ جلال الدین عجیب اُلجھن میں مبتلا تھا۔ پوری مسلم آبادی میں سے صرف ایک وہ مسلمان تھا جو کانگریس کے خیمے کے باہر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور ایک ایک ووٹر کو سمجھا رہا تھا کہ سفید رنگ کے ڈبے میں پرچی ڈالنی ہے۔ اُس دن نعرے لگانے کی ممانعت

تھی، اسی لئے مسلمانوں کو جلال الدین کی تضحیک کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ وہ
دُور ہی دُور سے اشاروں کنایوں سے مولوی صاحب کو چھیڑ رہے تھے۔
اُن کے بیٹے پوتے اور دوسرے رشتہ دار مسلم لیگی نمائندے کو ووٹ
دے کر فوراً ہی گھر چلے گئے۔ جب وہ واپس جا رہے تھے تو رفیق احمد قصائی
نے جو مسلم لیگ کا پروپیگنڈا سیکرٹری تھا، مولوی کے ایک بیٹے کو الگ بُلا کر
کہا "ایک خفیہ بات تجھے بتا رہا ہوں۔ مسلمانوں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج مولوی
صاحب کا جلوس نکالنا ہے۔ اگر میری بات مانے تو اُنھیں اپنے ساتھ ہی
لے جا۔"

اُس نے جواب دیا "جلوس نکالو یا کچھ اور کرو، ہمارا اب اُن سے
کوئی تعلق نہیں ہے۔"

شام کو عصر کے وقت ووٹنگ ختم ہوگئی تو دونوں پارٹیوں کے
رضاکاروں نے اپنا اپنا سامان کاندھوں پر لادا اور گاؤں میں واپس آنے
لگے۔ مولوی جلال کانگریسی رضاکاروں کے ساتھ چل رہا تھا۔ مسلم لیگی رضاکار
اُس سے کچھ ہی فاصلے پر آج کی شاندار کامیابی پر ٹھٹھے لگاتے ہوئے جا رہے
تھے۔ سینکڑوں بچّوں کا ہجوم سرکاری ممانعت کے باوجود نعرے لگا رہا تھا

"لے کے رہیں گے پاکستان۔"

"پاکستان کا مطلب کیا؟"

"لا الٰہ الا اللہ۔"

منشی شجاعت علی تیتر باز نے رضاکاروں سے ہٹ کر بچوں سے کہا "ابے مولوی جلال کا جلوس کیوں نہیں نکال لیتے۔ وہ دیکھو سامنے گدھا پھر رہا ہے۔ مولوی کو اس پر بیٹھا کر ذرا تماشہ دکھاؤ۔"

کچھ بچے گدھے کا کان پکڑ کر مولوی کے قریب لے گئے۔ پھر تمام لڑکوں نے مل جل کر بڑے میاں کو گدھے پر بیٹھا دیا۔ قہقہوں اور نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ "پنڈت نہرو — زندہ باد — پنڈت نہرو — زندہ باد۔"

کانگریسی رضاکار بھی بچوں اور مسلم لیگیوں کے ساتھ مل کر اس تماشے میں شریک ہو گئے۔ جلال الدین زندگی میں پہلی مرتبہ تنہا رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس نے اسے دھتکار دیا ہے اور مسلم لیگ نے اسے اپنے آغوش میں چھپانے سے انکار کر دیا ہے۔ جلوس بڑے بازار میں داخل ہوا۔ ہندو دکاندار اور گاہک تھڑوں پر کھڑے ہو ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ انھیں آج مولوی صاحب

سے شاید کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ پنڈت نہرو کو زندہ باد کہا جا رہا تھا، اس لئے
اُن کے پاس مخالفت کرنے کا بھی کوئی جواز نہ تھا۔ مولوی جلال گدھے پر،
سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا اور کبھی کبھی لالاؤں اور جاٹوں کو رحم طلب نگاہوں
سے دیکھتا تھا اور کبھی کبھار دانت کچکچا کر رہ جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر بچے
اور بھی شور مچاتے اور زیادہ جوش و خروش سے نعرے لگاتے "پنڈت
نہرو، زندہ باد"، اور چونکہ مولوی اپنے قد و قامت اور لمبی سفید داڑھی
کے اعتبار سے بالکل عبدالغفار خاں معلوم ہوتا تھا، اس لئے خاص طور پہ
"سرحدی گاندھی، زندہ باد" کے نعرے فضا میں گونجتے تھے۔ اس نعرے پہ
تو اس کا خون کھولنے لگتا۔ اس نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ تئیس برس
کی مسلسل سیاسی جد و جہد کا انعام اُسے یہ مل رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں
یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ گھر جاتے ہی خودکشی کر لوں گا۔

جلوس چھوٹے بازار میں داخل ہوا جہاں سے مسلمانوں کی دکانیں شروع
ہو جاتی تھیں۔ چھیمو حلوائی نے اپنے چولھے سے راکھ کریدے میں بھری اور آ کر
مولوی صاحب کے چہرے پر مل دی۔ اُس زمانے میں چھوٹے بازار میں ہندو
عام طور پہ داخل نہ ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں اُن کی اخلاقی حمایت کرنے والا بھی

کوئی نہ تھا۔ مسلمانوں نے خوب ہی کھُل کھیلا۔ گلے میں جوتیوں کا ہار پہنایا گیا ماتھے پر تلک لگایا گیا۔ غلام محمد نائی کی قینچی سے آدھی آدھی داڑھی بے ترتیبی سے تراشی گئی۔ مولوی صاحب کی یہ دُرگت دیکھ کر اُن کا ایک بیٹا آگے بڑھا لیکن قریب آکر اپنی بے عزّتی کے خیال سے زیادہ وہ اپنے اس جذبے سے ٹھٹھک گیا کہ اس کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیئے تھا۔ مولوی نے بیٹے کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر چہرہ گدھے کی گردن پر رکھ لیا۔ جلوس بڑھتے بڑھتے عالمگیر مسجد کے چوک میں پہنچا۔ چوک میں پہلے ہی سے تین تخت اُوپر تلے رکھ کر ایک سٹیج بنا دی گئی تھی۔ مولوی کو سٹیج پر بٹھا دیا گیا اور تمام مرد اور بچے سٹیج کے چاروں طرف چپ چاپ بیٹھ گئے۔ منشی شجاعت علی نے خطاب کرتے ہوئے کہا " اب آپ کے سامنے شری پنڈت نہرو ایک تقریر کریں گے "۔ لوگوں نے تالیاں بجا بجا کر ایک بار پھر نعرے لگائے "پنڈت نہرو، زندہ باد!"

چند آدمیوں نے اُسے زبردستی کھڑا کر دیا، پھر خود بیٹھ گئے۔ دو ڈھائی ہزار کے مجمع میں صرف مولوی صاحب کھڑے ہوئے تھے، باقی سب چُپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے گلے میں جوتیوں کا ہار، چہرے پر

چولہے کی راکھ، ماتھے پہ تلک، سر پہ گاندھی ٹوپی، کھدر کی سفید اچکن اور سفید پاجامہ۔ بچّوں کو ہنسی آگئی۔ بڑوں نے بھی قہقہے لگانا اور تالیاں بجانا شروع کر دیا۔ نعروں کی آواز اُٹھنے ہی والی تھی کہ منشی شجاعت علی نے کہا: "بھائیو! اب نعروں کی ضرورت نہیں ہے۔ نعرے پنڈت جی کی تقریر کے بعد لگائے جائیں گے۔"

مولوی صاحب کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ مجمع سے خطاب کرتے۔ اس سے پہلے سینکڑوں بار اُنھوں نے کانگرسی اجتماعوں کو خطاب کیا تھا اور اپنی لچھےدار تقریروں سے اُنھیں متاثر کیا تھا۔ مسلم لیگی جلسے کو پہلی بار خطاب کرنا پڑ رہا تھا۔ اُنھوں نے اپنے زورِ خطابت کو پوری طرح مجتمع کرتے ہوئے کہا:

"میرے مسلمان بھائیو! تمھیں یاد ہوگا کہ آج سے چند سال پیشتر جب شیخ جمشید علی کافر ہو گئے تھے اور ان کا نام چودھری لعل سنگھ رکھ دیا گیا تھا تو آپ لوگوں نے اُنھیں خلوصِ دل سے معاف کر دیا تھا۔ اُنھوں نے اسی عالمگیر مسجد میں، جہاں آپ نے اور آپ کے باپ دادا نے برسوں میرے پیچھے نماز پڑھی ہے،

آپ کے سامنے آکر معافی مانگی تھی اور آپ نے اُنھیں دوبارہ
دائرۂ اسلام میں داخل کر لیا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے،
میں نے آج تک ایک لمحہ کے ہزارویں حصّے کے لئے بھی
اللہ کی رسّی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس سلوک کے باوجود جو
میرے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے، میرے دل سے یہی آوازیں
آرہی ہیں کہ میں صراطِ مستقیم پر ہوں اور آپ خدا کے بتلائے
ہوئے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ انگریز کے
چند پٹھوؤں کے ہاتھوں میں کھلونے بنے ہوئے ہیں اور انہی
کے اشاروں پر کٹھ پتلیوں کا ناچ ناچ رہے ہیں۔ ہماری جنگ
انگریزوں سے ہے، ہندوؤں سے نہیں۔ پھر بھی میں آپ کو
کچھ نہیں کہتا، آپ جدھر جانا چاہتے ہیں شوق سے جائیں۔

. . . .

میں آپ کو نہیں روکوں گا۔ لیکن خدا رسول کا واسطہ
دے کر یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے بھی میرے راستے پر چلنے کی اجازت
ہونی چاہیے۔ میں آپ کے معاملات میں دخل نہیں دیتا تو پھر

آپ میرے معاملات میں دخل کیوں دیتے ہیں۔ آخر میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ نے آج اپنے قصبہ کے سب سے بوڑھے شخص کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، وہ اس کے بدلے میں آپ کو خلوصِ قلب سے دُعائیں دیتا ہے۔ اللہ کے گھر میں اذان ہو رہی ہے۔ آپ کو اُس کی بارگاہ میں سر بسجود ہونے کے لئے بُلایا جا رہا ہے۔ سُورج ڈوب رہا ہے۔ دونوں وقت مل رہے ہیں۔ آؤ آج ہم سب مل کر نماز پڑھیں۔ خُدا آپ کو . . . .

رسُول اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن کرے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ میں آپ کی وجہ سے عصر کی نماز بھی نہیں پڑھ سکا ہوں۔ حالانکہ میں وہ شخص ہوں جس نے انگریزوں کی سنگینوں کی چھاؤں میں بھی نماز قضا تک نہیں ہونے دی۔ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو تاکہ میں خداوند قدوس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر نماز ادا کر سکوں۔"

یہ کہہ کر مولوی جلال الدین سٹیج پر بیٹھ گیا۔ عالمگیر مسجد میں مغرب کی

اذان ہو رہی تھی۔ اذان ختم ہونے کے بعد منشی شجاعت علی نے چند فقروں پر مشتمل ایک تقریر کی:

"شریف آباد کے مسلمانو! میری تجویز یہ ہے کہ آج سے مولوی جلال الدین کا نام پنڈت نہرو رکھ دیا جائے اور شریف آباد کی ساتوں مسجدوں میں ان کا داخلہ بند کر دیا جائے۔ جن حضرات کو میری اس تجویز سے اتفاق ہو، وہ ہاتھ اُٹھا لیں۔"

مجمع کے ایک ایک شخص، ایک ایک بچے، حتیٰ کہ خود مولوی جلال کی اولادوں نے بھی ہاتھ اُٹھا لیے . . . . .

وہ دن اور آج کا دن مولوی جلال الدین کو شریف آباد اور ۱۹۴۷ء کے بعد رتہ کھنہ کا بچہ بچہ پنڈت نہرو کے نام سے یاد کرتا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ گھر میں بھی اسی نام سے پکارا جانے لگا۔ وہ خودکشی تو نہ کر سکا لیکن اُس نے اُسی دن گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ رات کو عشاء کے بعد تمام بیٹوں اور پوتوں نے جمع ہو کر صاف صاف کہہ دیا تھا "آج سے تم ہمارے باپ، نہ ہم تمہاری اولاد۔" وہ رات دن چوبارے میں پڑا ہوا یادِ الٰہی میں مصروف رہتا تھا۔ زندگی کے عملی کاموں سے اُس نے ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے توبہ کر لی اور ہر وقت موت کی دُعائیں مانگنے لگا۔ یوں اُسے سکونِ قلب بھی حاصل تھا۔ گزرے ہوئے نوّے برس کی زندگی کا ایک فعل بھی اُسے ایسا نظر نہ آتا تھا جس پر اُسے اپنے آپ سے شرمندگی ہوتی۔ دھوبی کی لاش کو گڑھے میں دفنانے کے عوض ایک انگریز سے دو سو روپے وصول کرنے کا خیال کبھی کبھی آتا بھی، تو جلدی ہی سرسیّد کو دیئے ہوئے چندے کی نیکی اس خیال پر پردہ ڈال لیتی۔ اس ایک واقعہ کے علاوہ وہ اپنے ہر فعل پر فخر محسوس کرتا تھا۔ اخبارات کا مطالعہ اُس نے قطعاً بند کر دیا۔ خارجی حالات اور اُن کے اثرات اب اُس کی شخصیّت پر پڑ ہی نہ سکتے تھے۔ صبح شام کوئی بہو بیٹی روٹی کی چنگیری اور پانی کا گلاس اُس کے آگے رکھ جاتی اور تھوڑی دیر بعد اُٹھا کر لے جاتی۔ کسی سے بولنا نہ چالنا۔ پنجاب میں خضر حیات خاں ٹوانہ کی مخلوط وزارت کے خلاف کیسے کیسے ہنگامے ہوئے۔ بنگال، نواکھلی، بہار، گڑھ مکتسر اور میوات میں کیسے کیسے قتل و خون ہوئے، لیکن ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر پنڈت نہرو ان واقعات سے بالکل بے خبر رہا۔ اگر وہ باعمل رہتا تو وہ اپنی فطرت کے مطابق ضرور حصّہ لیتا اور شاید اپنی تقدیر کے مطابق اُسے رُسوائی ہی ملتی۔

ایک دن کیا ہوا کہ وہ جمعہ کو حجامت کرانے کے لئے بازار میں چلا آیا۔ غلام محمد نائی نے اُس کی حجامت کرنے سے انکار کر دیا تو اُس کے غصیلے قدم خود بخود بڑے بازار کی طرف اُٹھ گئے۔ بڑبڑاتا ہوا بڑے بازار میں داخل ہوا اور من پھول حجام کی دکان پر پہنچا۔ من پھول ایک اور گاہک کے بال کاٹ رہا تھا۔ پنڈت نہرو لمبے چوڑے شیشے میں اپنے آپ سے آنکھیں ملا رہا تھا۔ شیشے ہی میں اُسے دُور ایک بنچ پر اخبار "پرتاپ" پڑا ہوا نظر آیا۔ اُس کے ہاتھ خود بخود اخبار کی طرف بڑھے۔ سُرخی تھی "کانگرس نے ماؤنٹ بیٹن کا فارمولا پاکستان منظور کر لیا۔" اُس کے نیچے ذیلی سُرخی یہ تھی "۳ جون کو کانگرس، مسلم لیگ اور سکھوں کی طرف سے سرکاری پلان کی منظوری کا اعلان کر دیا جائے گا۔" پنڈت نہرو نے جھلا کر "پرتاپ" بنچ پر پھینک دیا اور حجامت کرائے بغیر من پھول کی دکان سے واپس آ گیا۔ دو دن تک چوبارے میں بھوکا پیاسا پڑا رہا۔ روٹی کا نوالہ زہر ہو گیا۔ پانی کا گھونٹ حلق سے نیچے اُترتا ہی نہ تھا۔

۳ جون کی صُبح کو فجر کی نماز کے بعد اُس نے غسل کیا، سفید کھدر کی اچکن اور پاجامہ پہنا۔ سر پہ ڈھلی ہوئی گاندھی ٹوپی رکھی۔ صبح ہی صبح اڈے پر

پہنچا اور ہریانہ ٹرانسپورٹ کمپنی کی لاری میں بیٹھ کر کوئی گیارہ بجے دہلی آگیا۔

جب لاری قرول باغ کے پہلو سے گزر رہی تھی تو اُس نے اُچک اُچک کر کانگریس کے دفتر پر نظر ڈالی، لیکن دفتر دکھائی نہ دیا۔ کلینر سے کہا۔ "مجھے یہیں اُترنا ہے میاں بھائی۔" کلینر نے کہا: "لاری اڈّے پر کھڑی ہو گی جناب۔ شہر میں کہیں نہ رُکے گی۔" لاری اپنے اڈّے نیلی واڑہ پر جا رُکی۔ تمام سواریاں اُتر گئیں۔ پنڈت نہرو دیر تک ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ دیکھا کہ سامنے ایک اونچی سی دکان کے برآمدے میں سیمنٹ کا ایک چبوترہ سا بنا ہوا ہے۔ چبوترے پر سبز، پیلا اور سفید رنگ پھیر کر ترنگا جھنڈا بنایا ہوا ہے۔ وہ سڑک پار کر کے چبوترے پر پہنچا۔ لکھا تھا۔ "ہندوؤں کی پیاؤ۔" ایک شخص پیاؤ کے اندر بیٹھا ہوا بانس کی ایک بانسری جیسی پتلی سی نال سے لوگوں کو برف کا ٹھنڈا پانی پلا رہا تھا۔ چار پانچ اشخاص جو وہاں کھڑے تھے، پانی پی کر ایک طرف ہٹ گئے تو پنڈت نہرو اوک کر کے کھڑا ہو گیا۔ پیاؤ کے اندر بیٹھے ہوئے شخص نے نالی میں پانی ڈالا۔ پہلی گھونٹ پنڈت نہرو کے حلق سے اُتری ہی تھی کہ اُس شخص نے

ایک جھٹکے کے ساتھ نال ہٹالی۔ نال میں آیا ہوا بقیہ پانی پنڈت نہرو کے چہرے اور اچکن پر گر پڑا۔ اُس شخص نے غصّہ سے کہا "بڑے میاں، کہیں اور جاکر پیو پانی۔ یہ ہندوؤں کی پیاؤ ہے۔ سمجھے!"

پنڈت نہرو نے دھیمے لہجے میں کہا "ارے بھائی! ہزاروں مرتبہ ہندوؤں کی پیاؤ سے پانی پیا ہے۔ آج کیا ہو گیا ہے۔"

اُس شخص نے کہا "اب ہندوؤں کی پیاؤ سے پانی نہ ملے گا۔ بڑے عیش اڑائے ہیں تم لوگوں نے۔ چلو چلو آگے بڑھو، ورنہ . . ."

پنڈت نہرو اُسے گھورتا ہوا پیچھے ہٹ گیا اور ڈاڑھی اور اچکن پہ پڑے ہوئے پانی کے قطرے خشک کرنے لگا۔ اُس نے سوچا، یہ کیسا انقلاب آیا ہوا ہے یہاں۔ کیا ہو گیا ہے لوگوں کو۔ ہندو مسلمانوں کا پانی نہ پیتے تھے لیکن مسلمان تو ہندوؤں کے گھر کا پکا ہوا کھانا بھی کھا لیا کرتے تھے۔ آخر یہ ہوا کیا ہے؟

اُس نے ایک ٹانگہ لیا اور کوچوان سے قرول باغ چلنے کو کہا۔ ٹانگے میں بیٹھے ہوئے وہ دلّی کی عمارتوں، سڑک پہ چلتے ہوئے ٹانگوں، سائیکلوں، ٹراموں اور دو رویہ پٹڑیوں پہ چلتے ہوئے پیدل لوگوں کو غور سے

دیکھتا رہا۔ کہیں اُسے ایک خاص حد تک مُسلمان ہی مُسلمان نظر آ رہے تھے اور کہیں ہندو ہی ہندو۔ پہلے جیسا منظر کہیں بھی نہ تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور دھوتیاں ساتھ ساتھ دکھائی دے رہی ہوں۔ ترول باغ میں کانگرس کے مقامی دفتر میں پہنچا تو دیکھا کہ صرف ایک رضاکار موجود تھا اور وہ بھی ایسا جو پنڈت نہرو سے واقف نہ تھا۔ پہلے تو جب وہ یہاں آیا کرتا تھا تو بیسیوں رضاکار اُس سے لپٹ لپٹ کر ملتے تھے اور آتے ہی شربت یا چائے پلایا کرتے تھے۔ پنڈت نہرو نے اجنبی کلرک سے صرف ایک ہی بات پُوچھی "اس وقت پنڈت نہرو کہاں ملیں گے؟"

رضاکار کلرک نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پُوچھا۔

"کسے پُوچھ رہے ہیں آپ؟"

پنڈت نہرو نے کہا "پنڈت نہرو کو۔"

کلرک نے جواب دیا "وہ تو آصف علی کے مکان پر ہیں۔"

"وہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم۔"

"ارے میاں، تم مجھے نہیں جانتے شاید۔ میں ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی ہتک رو

کا ممبر ہوں۔ پچھلے کئی برس تک صدر بھی رہ چکا ہوں۔"

کلرک نے پھر بھی رُکھائی سے کہا "اچھا اچھا۔ آج شام کو پنڈت جی ریڈیو سے ایک تقریر کر رہے ہیں، کانگرس کی طرف سے۔ کانگرس نے پاکستان کو تسلیم کر لیا ہے۔"

پنڈت نہرو دم بخود رہ گیا "کیوں.... مگر کیوں؟...."

رضاکار نے کہا "کیوں کا تو مجھے معلوم نہیں۔ جناح اور سردار بلدیو سنگھ بھی تقریریں کریں گے۔ شام کو خود سُن لینا۔"

پنڈت نہرو چند منٹ تک خاموش بیٹھا بھوؤں کے بال نوچتا رہا پھر رضاکار سے مصافحہ کر کے باہر آ گیا۔ آصف علی کے مکان کو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ دریا گنج میں کوچہ چیلان ہیں واقع ہے۔ کوچہ چیلان میں اُس کی بیٹی بیاہی ہوئی تھی اور جب بھی وہ دہلی آتا تھا، بیٹی ہی کے ہاں ٹھہرتا تھا۔ ٹانگہ صدر، کھاری باؤلی، گھنٹہ گھر، فوارہ، چاندنی چوک، پتھر والا کنواں، جامع مسجد، ایڈورڈ پارک اور لال قلعہ کے پاس سے ہوتا ہوا دریا گنج پہنچا تو کوچوان نے پنڈت نہرو کو کوچے سے باہر ہی اُتار دیا۔ اندر مسلم لیگیوں نے ایک احتجاجی جلوس نکالا ہوا تھا۔ وہ یہ پسند نہیں کرتے

تھے کہ کوئی کانگریسی مسلمان اُن کے محلّے میں آئے، اور وہاں آج مولانا
آزاد آئے ہوئے تھے۔ پنڈت نہرو تانگے سے اُتر کر پھول کی منڈی کے
ساتھ ساتھ ہوتا ہوا ذرا اندر گیا تو دیکھا کہ تختہ گلیوں میں سیاہ جھنڈیاں لگی
ہوئی ہیں۔ وہ ہجوم کو چیرتا ہوا قدم بہ قدم آگے بڑھتا رہا۔ مولانا راشد الخیری
کے رسالے "عصمت" والی گلی کے پاس اُسے تقریباً آدھ گھنٹے تک
ٹھہرنا پڑا۔ مسلم لیگی "قائدِ اعظم زندہ باد" اور "شو بوائے، گو بیک" کے نعرے
لگا رہے تھے۔ تب پیچھے سے ہجوم کا ایک ریلا آیا اور پنڈت نہرو اُس ریلے
کے ساتھ بہتا ہوا مُلّا واحدی کے گھر تک جا پہنچا۔ مُلّا واحدی کسی زمانے
میں کانگرس کے زبردست حمایتی رہے تھے۔ اُن کے اُونچے مکان کے
باہر ایک تختی لٹکی ہوئی تھی جس پر "دفتر رسالہ نظام المشائخ" لکھا ہوا
تھا۔ پنڈت نہرو اس سے پہلے کئی بار یہاں اپنے مرشد خواجہ حسن نظامی
سے ملنے آیا تھا جو مُلّا واحدی کے گہرے دوست تھے۔ مُلّا واحدی کے گھر
کے عین سامنے مسجد کالے خاں کے متصل اُس کی بیٹی کا گھر تھا۔ بیٹی تو کئی
برس ہوئے اللہ کو پیاری ہو چکی تھی، لیکن اُس کی تینوں نواسیاں چلمن میں
کھڑی ہوئی، جلوس کا نظارہ دیکھ رہی تھیں۔ اس کے نواسے بھی کہیں کہیں

جلوس ہی میں ہوں گے۔ اُس نے چاہا کہ بیٹی کے گھر سے پہلے روٹی کھالو۔ نواسیوں کو ایک دو مرتبہ ہاتھ کا اشارہ بھی کیا۔ لیکن اُن کی نظریں اُس کی طرف نہ آسکیں۔ ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ وہ گلی کے دوسرے سرے پہ جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ پیچھے سے آتے ہوئے جوانوں کے ساتھ ہی وہ آگے بڑھ گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد ناول نویس اور پھر مولانا محمد حسین آزاد کے گھر سے نکل کر اُسے نیم کا وہ درخت نظر آنے لگا جو آصف علی کے مکان کی شمالی دیوار میں اُگا کھڑا تھا۔ آصف علی کے مکان کے آگے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ اُسے مکان کے دروازے تک جانے کی اُمید بھی نہ رہی تھی۔ اُسے وہاں تک جانے کے اور راستے معلوم نہ تھے۔ لکڑیوں کی ٹال پہ کھڑا دیر تک تصوّر ہی تصوّر میں یہ نامعلوم راستے یاد کرتا رہا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے مکان کے آگے سے نکل کر کھجور والی گلی میں ہو کر پیچھے سے حکیم مومن خاں کی گلی کے راستے اُس نے جانے کی خواہش کی، لیکن کوشش میں ناکام رہا۔ آخر کوئی ایک بجے تراہا بیرم خاں کی طرف سے ایک سفید رنگ کی لمبی سی چمکتی ہوئی کار آئی جس کے ساتھ پولیس کی ایک جیپ کار بھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد گاندھی جی آصف علی کے مکان سے باہر آئے اور جلدی سے کار میں

بیٹھ گئے۔ فضا "شوبو ائے، گوبیک" کے نعروں سے گونجی ہوئی تھی۔ کار روک لی گئی۔ اب نعرۂ تکبیر فضا میں گونجنے لگا۔ پولیس کی جیپ بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ آگے چل کر راستہ ہموار کر رہی تھی اور گاندھی جی اپنی کار میں دو تین اور اشخاص کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ اُن کی کار جب ٹال کے پاس سے گزری تو پنڈت نہرو نے دُور سے ہاتھ اُٹھا کر سلام کیا اور گاندھی جی نے بھی ایک جانی پہچانی صورت دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا۔ مسلم لیگیوں کا جلوس کار کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اب آصف علی کے مکان تک جانا قدرے آسان ہو گیا تھا۔ پنڈت نہرو ٹال سے اُترا اور جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ لمبے چوڑے پھاٹک نما دروازے پر پولیس انسپکٹر اور کچھ سپاہی بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ پنڈت نہرو نے ایک سپاہی سے خوشامدانہ انداز میں کہا "میں پنڈت نہرو سے ملنا چاہتا ہوں۔"

سپاہی نے مولوی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "اجازت نہیں ہے۔"

پنڈت نہرو اپنا سا مُنہ لے کر سیڑھیوں پر ہی ایک طرف ہٹ کر کھڑا

ہو گیا۔ کافی دیر بعد دہلی کانگرس کا مقامی پروپیگنڈا سیکرٹری دروازے پر آیا اور پولیس انسپکٹر سے کچھ باتیں کرنے لگا۔ پنڈت نہرو اس عینک والے شخص سے کئی بار قرول باغ آفس میں مل چکا تھا۔ اتفاق سے اس کا نام پنڈت نہرو کے دماغ سے نکل گیا۔ جب وہ انسپکٹر سے باتیں کر کے واپس چلنے لگا تو پنڈت نہرو نے دور سے آواز دی "لالہ جی۔"

سیکرٹری نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عینک درست کرتے ہوئے قریب آیا اور کہنے لگا "میرا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہے۔ اگر میں بھولا نہیں ہوں تو آپ شریف آباد کے مولوی جلال الدین ہیں نا۔ میں انتخابی دورے پر آپ کے ہاں پنڈت جی کے ساتھ گیا تھا۔ جب آپ کو انھوں نے اپنا ہار پہنا دیا تھا۔"

پنڈت نہرو نے کہا "جی ہاں جی ہاں۔ میں وہی ہوں۔"

"فرمایئے، کیا بات ہے؟"

"میں پنڈت جی سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک ضروری کام ہے۔"

"آپ ایک چٹ لکھ دیں، اگر وہ ملنا چاہیں گے تو آپ کو بلا لیں گے۔"

پنڈت نہرو نے سیکرٹری ہی سے پن اور کاغذ لے کر لکھ دیا "تمھارا چاچا جلال الدین شریف آباد والا ملنے آیا ہے۔"

چند ہی منٹوں کے بعد جواہر لال گیروے کرتے اور واسکٹ میں ملبوس دہلیز میں آئے۔ ادھر سے پنڈت نہرو لپک کر دہلیز میں گیا اور دونوں نہرو ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔

جواہر لال نے پوچھا "کیسے آئے چاچا؟"

"ویسے ہی چلا آیا تھا۔ اخبار میں پڑھا تھا کہ کانگرس نے پاکستان کو تسلیم کر لیا ہے۔"

"ہاں چاچا، اس کے بغیر کوئی اور چارہ نہ رہا تھا ہمارے لئے۔"

"تو کیا ہماری وہ قربانیاں رائیگاں گئیں؟"، پنڈت نہرو اداس ہو گیا۔

"رائیگاں کیوں گئیں۔ پاکستان کو ہم نے سر دست تسلیم کیا ہے جب ہماری حکومت قائم ہو جائے گی تو اُس وقت دیکھا جائے گا۔ کبھی بھارت ماتا کے بھی ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ پہلے تو انگریزوں کو یہاں سے نکال لینے کا مسئلہ ہے۔"

پنڈت نہرو اور بھی اُداس ہو گیا۔" اچھا، پنڈت جی، بس اتنی ہی بات کرنے آیا تھا۔ اب میں چلا۔"

جواہر لال نے پنڈت نہرو کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور اُسے پکڑ کر اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ لمبے چوڑے صحن کو عبور کر کے وہ ڈرائینگ روم میں پہنچے۔ جواہر لال نے پنڈت نہرو کو دروازے کے پاس ہی بچھے ہوئے ایک صوفے پہ بٹھا دیا اور کہا "ہم ذرا گفتگو سے فارغ ہو لیں، پھر ساتھ چلیں گے۔ کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ بس پندرہ بیس منٹ کی بات ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر مولانا آزاد کے پہلو میں جا بیٹھے۔

آج شام کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے جو تقریر کانگرس کی طرف سے جواہر لال کو نشر کرنی تھی، وہ خود ہی لکھ لائے تھے۔ مسودے کے ایک ایک لفظ پر کانگرس ہائی کمان میں بحث و تمحیص ہو رہی تھی۔ گاندھی جی تو اپنے مشورے دے کر چلے گئے تھے۔ مسودہ جواہر لال کے ہاتھ میں تھا اور دوسرے لیڈر اپنے اپنے مشورے اور ترمیمیں دُور بیٹھے ہوئے بتا رہے تھے۔ بڑے صوفے پہ ارونا آصف علی، سردار پٹیل اور پنڈت

گوبند بلبھ پنت تھے۔ آصف علی کے ساتھ بابو راجندر ناتھ پرشاد اور اچاریہ کرپلانی براجمان تھے۔ چند دن پیشتر کانگرس نے اگرچہ ماؤنٹ بیٹن کا پلان منظور کر کے ہندوستان کی تقسیم اور دو قومی نظریئے کو تسلیم کر لیا تھا، لیکن کانگرسی لیڈروں کے چہرے ہارے ہوئے جواریوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ رنگ فق تھا۔ خاص طور پر مولانا آزاد بہت اُداس اور آزردہ دکھائی دے رہے تھے۔ ایک فقرے میں مناسب ترمیم جب اُن سے نہ ہو سکی تو جھلا کر کہنے لگے "جواہر لال! کانگرس کی طرف سے اتنے ذلیل طریقے پر ہتھیار ڈال لینے کا منظر برداشت کر لینا میرے بس سے باہر ہے۔ تقسیم، ہندوستان کے لئے سب سے بڑا المیہ ہے اور اس کی تائید میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے مقدور بھر تقسیم سے . . . . بچنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ بہر حال ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے اور اس کا اظہار کانگرس کی طرف سے ہونے والے اعلان میں ضرور ہونا چاہیئے کہ قوم ایک ہے۔ اس کی تہذیبی زندگی ایک ہے اور ایک رہے گی۔ سیاسی طور پر ہم ناکام ہوئے اور اسی لئے تقسیم ملک پر مجبور ہو گئے۔ ہمیں اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہئے

لیکن ساتھ ہی ساتھ اس عہد کا بھی اعلان ہونی چاہیئے کہ ہماری تہذیب تقسیم نہیں ہوئی - اگر ہم پانی کو ایک چھڑی سے ہلائیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوگا، کہ پانی تقسیم ہوگیا، لیکن تقسیم نہیں ہوتا - چھڑی جیسے ہی ہٹائی جائے گی، تقسیم کے اثرات فوراً زائل ہو جائیں گے۔"

سردار پٹیل نے اپنی چادر کندھے پر ٹھیک طرح جماتے ہوئے کہا "مولانا صاحب! تقسیم ملک کا ریزولیوشن جبر یا کمزوری کا نتیجہ نہیں، بلکہ ہندوستان کے موجودہ حالات کا بہترین حل یہی ہے۔"

مولانا آزاد نے کہا "ہاں ہوگا، لیکن میرا دل نہیں مانتا۔"

جواہر لال نے غور سے مولانا آزاد کی طرف دیکھا اور کہا "دل کس کا مانتا ہے - آپ خود ہی بتائیے، ہم کیا کریں - آپ کہیں تو ہم اب بھی اس پلان کو ٹھکرانے کے لئے تیار ہیں۔"

پنڈت نہرو نے وہیں دروازے کے پاس بیٹھے بیٹھے کہا "ہاں ٹھکرا دینا چاہیئے۔"

سب کی نظریں پنڈت نہرو پر جم گئیں - مولانا آزاد نے جواہر لال سے پوچھا "یہ کون بزرگ ہیں؟"

جواہر لال نے تعارف کرایا۔ "یہ ہمارے بڑے پرانے رضاکار ہیں
مجھ سے ملنے آئے ہیں۔"

مولانا آزاد نے پنڈت نہرو کو نظر انداز کر کے جواہر لال کی بات کا سرا پکڑا۔ "میں کیا بتاؤں گا بھئی۔ اکثریت نے جو فیصلہ کر دیا ہے مجھے بھی تسلیم ہے، ویسے پھر بھی کہوں گا بھی، میرا دل نہیں مانتا۔"

پنڈت نہرو چیخا۔ "دل نہیں مانتا تو آپ سے زبردستی کون کر رہا ہے۔ آپ اسے ٹھکرا کیوں نہیں دیتے۔"

مولانا آزاد پنڈت نہرو کی اس مداخلت کو دوبارہ نظر انداز کر کے پھر مسودہ دیکھنے لگے۔ جواہر لال کے ہاتھ سے قلم لے کر انھوں نے ایک فقرہ کاٹ کر اُس کی شکل تبدیل کر دی۔ تقریر کی مناسب اصلاح و ترمیم کے بعد مسودہ ٹائپ کرانے کے لئے پروپیگنڈا سیکریٹری کو دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ ٹائپ شدہ کاپی فوراً پیش کی جائے تاکہ وائسرائے کو دکھا کر ریڈیو حکام کو بھجوا دی جائے۔

جواہر لال اُٹھے اور پنڈت نہرو کو ساتھ لے کر باہر صحن میں آ گئے اور مصالحانہ انداز میں گفتگو کرنے لگے۔ آصف علی نے قریب آ کر کہا۔ "کھانا

اب یہاں کھا لیجیئے۔"

ڈائیننگ۔روم میں پنڈت نہرو نے اعلیٰ کانگرسی لیڈروں کے ساتھ بیٹھ کر قسم قسم کے کھانے کھائے تھے۔ کھانے کے دوران جواہر لال بار بار پنڈت نہرو کا غصّہ دھیما کرتے رہے تھے۔" ہم نے یہ بٹوارہ مصلحتاً تسلیم کیا ہے ــــ کچھ عرصہ بعد پھر دونوں ملک ایک ہو جائیں گے۔آپ فکر نہ کریں چاچا جی"۔۔۔۔۔

پنڈت نہرو ہمیشہ اس دعوت میں شرکت پر شیخیاں بگھارا کرتا تھا۔ جواہر لال کے اُن فقروں کو وہ ہمیشہ خلوص پر مبنی سمجھتا رہا تھا لیکن آج اُنہی فقروں سے اُسے سیاسی عیّاری کی بُو آ رہی تھی۔اُس کے دماغ پر مسلسل یہی ایک خیال ہتھوڑے لگا رہا تھا" ہمیں دھوکہ دیا گیا ہے۔کانگرس نے دھوکہ دیا سو دیا، پنڈت نہرو نے بھی دیا ہے۔"

اُسے اب اپنے ماضی کی ایک ایک بات سے نفرت ہو رہی تھی۔نئی نئی پیدا شدہ نفرت کا غبار دل پر لیئے وہ شیشم کی ٹیڑھی میڑھی لکڑی ٹیکتا ہوا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔کھدر کا پھٹا ہوا، میلا کچیلا کرتا پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔تین دن کا پیاسا جسم صبح سے کھیتوں کی کھائیوں اور

نہر کے پُل کی طرف جاتی ہوئی پگڈنڈی پر چل رہا تھا۔ اب تو وہ پیاس کی شدت سے نڈھال سا ہو رہا تھا۔ بڑھاپے کی خستہ حال پیاسی ہڈیاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اُس نے ایک ہاتھ سے لاٹھی سنبھالی اور دوسرا ہاتھ جھکی ہوئی کمر پر رکھ لیا۔ آنکھیں اوپر اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ نزدیک ہی برگد کا بھاری بھرکم درخت تھا۔ وہ اسی طرح جھکا جھکا درخت کے پاس پہنچا اور دُھوپ کی ترچھی شعاعوں سے بچ کر جڑ کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ درخت پر کوئی ایک گز پر محکمہ انہار کے ملازم نے چھال اس طرح کاٹی ہوئی تھی کہ درخت کی سفید جلد نظر آنے لگی تھی۔ سفید نشان پر '۱۹۵۵' لکھا ہوا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ۵۵ء کا تباہ کُن سیلاب اس نشان تک پہنچا تھا۔ پنڈت نہرو کے عین سر پر ایک شاخ پر کوؤں کا ایک جوڑا چیخ رہا تھا۔ "کائیں کائیں"۔ تھکن اتارنے کے لئے وہ کانپتے ہوئے کمزور ہاتھوں سے لرزتی ہوئی پنڈلیاں دبانے لگا۔ ہاتھوں کے بال سفید ہو گئے تھے۔ پنڈلیوں کے بال سفید تھے، سر کے بال سفید تھے۔ داڑھی سفید تھی۔ سفید بھوؤں کے نیچے سفید پلکوں کی آغوش میں گھری ہوئی چھوٹی چھوٹی میچکی ہوئی بے نُور آنکھوں سے لال لال چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

پنڈلیاں دباتے دباتے اُس نے اچانک کمر کے نچلے حصّے میں درد محسوس کیا، اب وہ کمر دبانے لگا۔ درد ریڑھ کی ہڈی کے ایک ایک مہرے سے گزرتا ہُوا گردن میں آگیا۔ وہ ایک ہاتھ سے گردن دبانے لگا۔ درد سرک کر بائیں کندھے پر آگیا۔ اُس کا ہاتھ جلدی سے بائیں کندھے پر گیا۔ تو درد اُڑ کر دائیں کندھے پر آپہنچا۔ اُس نے دوسرا ہاتھ دائیں کندھے پر رکھ دیا۔ درد دونوں مونڈھوں سے نکل کر سر میں پہنچ گیا۔ پھر ہاتھوں میں بھی آگیا۔ درد کی لہریں ٹیسیں مارتی ہوئی اُس کی ایک ایک رگ میں سما گئی تھیں درد کی شدت سے اُس کے پھرے کی بھریاں جوار بھاٹے کی طرح کبھی اُوپر چڑھتی تھیں کبھی نیچے گرتی تھیں۔ اُس کی زبان پر ایک ہی کلمے کا ورد تھا۔ "ہائے . . . ہائے . . . ہائے . . . ."

درد، درد — درد ہی درد۔

وہ بے دم ہوکر زمین کے خاک آلود فرش پر ہی لیٹ گیا۔ انگلیوں سے آہستہ آہستہ آنکھیں سہلانے لگا، اور بھویں نوچنے لگا۔ اُسے یاد آرہا تھا کہ دو برس پہلے، صرف دو برس پہلے جب اس زمین میں سیلاب آیا تھا تو اُس کی کمر اتنی نہیں جھکی تھی۔ وہ جوانوں کی طرح کھیتی باڑی کے کاموں میں

حسبِ توفیق حصہ لیتا تھا، اور کچھ نہیں تو اپنی گایوں بھینسوں کو چراتا ہوا میلوں دُور نکل جاتا تھا۔ صبح روٹی کھا کر جو نکلتا تھا تو شام ہی کو واپس آتا تھا اور سارے دن اُسے معمولی سی بھوک بھی نہ لگتی تھی۔ سیلاب میں وہ کمر کمر پانی میں سے اکیلا گزر کر اس پیپل کے درخت تک آیا تھا جہاں اُن کی جھونپڑی بنی ہوئی تھی اور اتفاق سے اُس دن نئی خریدی ہوئی لال بھیڑی کھونٹے سے بندھی رہ گئی تھی جسے وہ 'لالی' کہا کرتا تھا۔ سیلاب سے اس کی ساری فصلیں تباہ ہو گئی تھیں۔ لیکن وہ اولاد کو صبر ہی کی تلقین کرتا رہا تھا۔ اُس وقت یہاں پانی کا ایک سمندر تھا اور اب زمینیں اور انسان اور چرند پرند پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے تھے۔ اُس نے سوچا کہ پرندے تو پھر سے اُڑ کر فوراً ہی اوکاڑے یا پاک پتن پہنچ جاتے ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ تو ہندوستان کی سرحد میں بھی چلے جاتے ہوں اور وہاں کسی نہ کسی جگہ بیٹھ کر اپنی پیاس بجھا لیتے ہوں۔ یہ بے چارے جانور اور انسان تو کہیں بھی نہیں جا سکتے اور اگر یہ چلے بھی جائیں تو زمینیں تو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتیں۔ زمینوں کا خیال آتے ہی وہ ماضی کی گود سے نکل کر مستقبل کی دُنیا میں ٹہلنے لگا۔

آخر ہو گا کیا؟ آسمان سے مینہ برستا نہیں، زمین کے نیچے سے پانی اُگلتا نہیں۔ نہروں میں اچھلتی ہوئی موجوں کی جگہ ریت کے ذرّے اڑ رہے ہیں۔ اے رب العالمین! پانی آئے گا کہاں سے؟ مستقبل کا فکر ماضی کے دُکھڑوں سے زیادہ اندوہ ناک ثابت ہو رہا تھا۔ درد اُس کے جسم سے نکل کر روح کی گہرائیوں میں پھر رہا تھا۔ وہ بلبلا کر اُٹھ بیٹھا اور جلدی جلدی کلمۂ طیب کا ورد کرنے لگا۔

سامنے سے نصرو گائیں، بھینسیں اور بکریاں چرا کر واپس لا رہا تھا اُس کی لال بہڑی گلّے سے نکل کر اُس کے پاس آکر ڈکرانے لگی۔ "ماآں ... ماآں ..." پنڈت نہرو نے اُٹھ کر "گئو ماتا" کی کمر پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کی گردن سہلائی۔ جلدی جلدی ہلتے ہوئے بے چین کانوں کے اعصاب کا تناؤ دُرست کیا۔ اُس کی آنکھوں کے پاس مُنہ لے جا کر، چُوم کر پُوچھا "کیا بات ہے لالی۔"

"ماآں ... ماآں ... ماوں ... اونہہ ... اونہہ۔"

نصرو نے قریب آکر ترجمانی کا حق ادا کیا۔ "پنڈت جی، اس کی بچھیا مر گئی بچھیا۔"

پنڈت نہرو نے یہ بات خلافِ معمول جلدی سے سُن لی۔ تیزی سے بولا "کیسے مرگئی ہے؟"

نصرو نے اسی طرح چیخ چیخ کر تشریح کی "پیاسی مرگئی پیاسی۔ دو ماہ کی ہی تو تھی۔ پرسوں سے بلبلا رہی تھی۔"

پنڈت نہرو نے جھلّا کر کہا "کم بخت! ہاڑ بن والے جوہڑ پر لے گیا ہوتا۔"

نصرو بولا۔ "آج صبح ڈنگروں کو وہیں لے گیا تھا۔ جوہڑ سوکھا پڑا ہے۔ بچھیا وہیں تو مری ہے۔ میں وہیں چھوڑ آیا۔ میں آپ پیاسا مر رہا ہوں۔"

پنڈت نہرو نے اپنے پڑپوتے نصرو کی طرف غور سے دیکھا۔ خون جوش میں آگیا۔ محبت آہ بھر کر رہ گئی۔ لیکن بددعا دیئے بغیر نہ رہ سکی۔ "خدا تجھے سمجھے گا پنڈت نہرو، تجھے بخشے گا نہیں۔ پیاسوں کی آہیں خالی نہ جائیں گی۔ ایسی جگہ پہنچے گا جہاں تو ابد تک ایسی ہی آگ میں جھُلستا رہے گا۔"

اُس کا کالو جو منمناتی ہوئی بکریوں کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چلا

آ رہا تھا، ہانپتا ہوُا آیا اور آتے ہی پنڈت نہرو کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ اُس کی زبان حلق سے اُکھڑ کر باہر لٹکی ہوئی تھی اور وہ اُچھل اُچھل کر پنڈت نہرو کی کمر پہ چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پنڈت نہرو نے اُسے چمکارا۔ کمر پہ ہاتھ پھیرا۔ اپنی کمر پر محبت کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی دُنیا کی سب سے باوفا مخلوق نڈھال ہو کر زمین پہ لیٹ گئی۔ پنڈت نہرو اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کا پیٹ سہلانے لگا۔ اُس کے بس میں ہوتا تو کرۂ ارض کے سارے سمندروں کا پانی ایک ہی چلّو میں سمیٹ کر کتّے کے مُنہ میں ڈال دیتا۔ شاید کتّے کو بھی اُسے سہلانے والے کی پیاس کا خیال آ گیا ہوگا۔ جبھی تو وہ تڑپ کر اُٹھا تھا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوُا بکریوں کے پاس چلا گیا تھا اور وہاں ایک جگہ کھڑا ہو کر، مڑ مڑ کر پنڈت نہرو کی طرف، دیکھنے لگا تھا۔

بھارت نہر دیپال پور کا پانی عارضی طور پہ بند کر کے پاکستان کے ساتھ کھیل کھیل رہا تھا، ذرا آزما رہا تھا کہ کتنے پانی میں ہے پاکستان۔ لیکن یہاں مذاق ہی مذاق میں زندگیاں سُوکھ رہی تھیں۔ ہڈیوں کا گودا نچڑ رہا تھا۔ گایوں بھینسوں، بکریوں اور عورتوں کا دُودھ خشک ہو رہا تھا۔ زندگی کے سوتے

خشک ہو رہے تھے اور موت کی وحشتناکیاں چاروں طرف منڈلاتی پھر رہی تھیں۔

پنڈت نہرو کے پاس آٹھ بھینسوں میں سے صرف ایک بھینس رہ گئی تھی ــــ بھوری بھینس جو کبھی صبح شام دس دس سیر دودھ دیا کرتی تھی اور جس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے والے کو دیر تک خود اپنی صحت کا احساس ہوتا رہتا تھا، ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی اور دوسرے تیسرے وقت بڑی مشکل سے سیر ڈیڑھ سیر دودھ دینے لگی تھی۔ دودھ کہاں سے اترتا، غذا دینے والی زمینوں پر ہرے ہرے چارے کی جگہ سوکھے سوکھے ڈنٹھل کھڑے تھے۔ پانی جو دودھ کی ماں ہے اور جس کی اٹھلاتی ہوئی موجیں زندگی کی کھیتی کو ہرا بھرا رکھتی ہیں، نہر کے کنارے کنارے پچاس پچاس میل کے علاقے سے ناپید ہو کر موت کی نحوست کسانوں کی روحوں پر طاری کر گیا تھا۔

پنڈت نہرو نے نصرو سے کہا "جا میاں تو اپنے ڈنگر لے جا جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔" اپنی دانست میں نصرو کی مناسب حوصلہ افزائی کرنے کے بعد وہ پھر نہر کے پل کی طرف چلنے لگا جو اس کھیت سے اب کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پہ رہ گیا تھا۔

پنڈت نہرو کے پاس خاموشی، بے بسی اور معصومیت کے سوا کیا رکھا تھا، ماضی میں نہ مستقبل میں۔ رہا حال تو اُس کا یہ عالم تھا کہ اُس کا دل زخمی کبوتر کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ پُرانی یادوں کے زخم تازہ ہو رہے تھے۔ رُوح کی طنابیں کھنچی ہوئی تھیں۔ جواہر لال، جیتے جاگتے جواہر لال کی صورت آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ کبھی لال لال گالوں پر تبسم کھیل رہا ہوتا کبھی غصے میں اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی ہوتیں۔ دفعتہً پنڈت نہرو کو آخری ملاقات یاد آگئی جس نے تھوڑی دیر کے لئے اُس کے وسوسوں اور شکوک کو دل کے کسی گہرے گوشے میں دفن کر دیا۔ ۱۴ اگست کو ہندوستان تقسیم کے اعلان کے ساتھ آزاد ہوا۔ وہ لوگ جو تقسیم کے دل سے قائل نہ تھے اور جنھوں نے وائسرائے کا پلان اوپرے دل سے قبول کیا تھا، جھنجھلا گئے ان کی جھنجھلاہٹ فسادات کے لال رنگ میں ظاہر ہوئی۔ قتل و خون کے اثرات شریف آباد تک پہنچے۔ بچا سرا ب کے ایک نئے انداز میں نمودار ہوا۔ ۱۹۳۸ء کی گئو کشی تحریک کے ہارے ہوئے جواری اب نئے ہتھیاروں سے لیس ہو کر آئے۔ جاٹوں کے ہمراہ مغربی پنجاب سے آئے ہوئے سکھ شرنارتھی بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ تین دن تک شریف آباد پر مسلسل

حملے ہوتے رہے، لیکن ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ تیسری رات پنڈت نہرو
چپکے سے شریف آباد سے نکلا اور جنگلوں اور جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا دہلی
پہنچا۔ ملّا واحدی کو ساتھ لے کر خواجہ حسن نظامی سے ملا۔ خواجہ صاحب نے
اپنے ایک اعلیٰ مسلمان افسر کو ٹیلی فون کیا۔ اُس نے فوراً پنڈت نہرو کے
ہمراہ ایک فوجی دستہ شریف آباد بھیج دیا۔ حملہ آور پیچھے ہٹ گئے اور
تین ہزار مسلمانوں کا قافلہ فوجی دستے کی حفاظت میں دہلی سے تین میل جنوب
مغرب میں پرانے قلعہ میں پہنچا۔ جہاں اب شہر دہلی اور مضافات کے لاکھوں
مسلمان پناہ گزینی اختیار کئے ہوئے تھے۔ پرانے قلعے سے ایک میل
پرے اُسی ہمایوں کا مقبرہ تھا جس نے ایران جاتے وقت پنڈت نہرو
کے دادا کے دادا کو ایک تلوار بطور انعام دی تھی۔ مقبرے میں بھی پناہ گزینوں
کا کیمپ کھولا گیا تھا۔ پنڈت نہرو اپنے خون کے ڈیڑھ سو افراد کے علاوہ
شریف آباد، بہادر گڑھ، سانپلہ، سونی پت، روہتک، جھجر، بادلی، نانگلوئی
نظام الدین اور دوسرے قصبات اور خود شہر دہلی کے لاکھوں مسلمانوں
کے ہمراہ پورے دو ماہ تک پڑا رہا۔ جس دن شریف آباد کا قافلہ یہاں پہنچا
تھا۔ ایک سپیشل ٹرین پٹیالہ کے سٹیشن پر ختم کر دی گئی تھی، اسی لئے ٹرینوں کا

سلسلہ عارضی طور پر بند تھا جو دو ماہ بعد شروع ہوا۔

آج علی الصباح رضاکاروں نے لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ اعلان کیا کہ ایک سپیشل ٹرین پاکستان روانہ ہوگی۔ پنڈت نہرو کے پوتوں اور نواسوں نے فیصلہ کیا کہ اسی ٹرین سے چلیں گے۔ نیچے کچھے سامان کی پوٹلیاں بندھنے لگیں۔ عورتیں اپنے زیورات جو وہ شریف آباد سے آتے وقت اپنے برقعوں کے نیچے چھپا لائی تھیں، موٹے موٹے پیڑوں میں گوندھ کر روٹیاں پکانے لگیں۔ پنڈت نہرو مسلسل دو ماہ تک خیمے کے کھونٹے پر سر رکھے چپ چاپ لیٹا رہا تھا اور ہر وقت تسبیح پھیرتا رہتا تھا۔ اب اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹہلتا ہوا خلعہ سے باہر نکل آیا۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا نظام الدین اولیا کے مزار پہ پہنچا۔ خواجہ حسن نظامی شہر دلی میں کسی میٹنگ میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ پنڈت نہرو کافی دیر تک باؤلی کی منڈیر پر ٹہلتا رہا۔ باؤلی میں آج بھی سبز پانی کھڑا تھا۔ آج یہاں کوئی عورت، کوئی مرد، کوئی بچہ اپنی روحانی یا جسمانی بیماری کا علاج کرنے کے لئے نہا نہیں رہا تھا۔ وہ مقبرے کے اندر چلا گیا اور بڑے مؤدب انداز میں پائینتی بیٹھ کر وظیفہ پڑھنے لگا۔ وظیفہ پڑھتے پڑھتے دل گداز ہو گیا۔

آنسو ٹپکنے لگے، ہچکیاں بندھ گئیں، مزار کو بوسہ دے کر وہ باہر نکلا اور دلّی کی فراخ چمکتی ہوئی سڑکوں پر چلتا ہوا، لوگوں سے اتا پتا پوچھتا ہوا کونسل چیمبر پہنچا۔ سڑکوں پر پنجاب سے آئے ہوئے، لٹے پٹے سکھ کرپانیں گھماتے ہوئے پھر رہے تھے۔ پنڈت نہرو شاید اپنے کانگریسی کرتے کی وجہ سے صاف بچ نکلا۔

چیمبر کی سیڑھیاں چڑھ کر دروازے میں آیا تو سپاہی نے روک لیا۔

کہنے لگا۔ "مجھے پنڈت نہرو سے ملنا ہے۔ اس وقت کہاں ہیں وہ؟"

سپاہی بولا۔ "اندر ہی ہیں، مگر ملنے کی اجازت نہیں ہے۔"

پنڈت نہرو دفعتہً جھنجھلا اٹھا۔ "اجازت کا کیا مطلب۔ وہ مجھے ملنے سے نہیں روک سکتا۔" اتنا کہہ کر وہ برآمدے میں چلا گیا۔

سپاہی سنگین آگے کر کے کھڑا ہو گیا۔ "آپ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

پنڈت نہرو اپنی پوری آواز سے چیخا۔ "مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ وائسرائے چھوڑ اس کا باپ کیوں نہ آجائے۔ یہ ہمیں کیسی آزادی

ملی ہے۔"

شور و غل کی آواز سن کر چند کانگرسی رضاکار اور کلرک اپنے اپنے کمروں سے نکل کر برآمدے میں آگئے۔ کافی دیر تک جھگڑا سا ہوتا رہا آخر ایک رضاکار نے ملاقات کرانے کا وعدہ کر لیا۔ "مولوی جلال الدین شریف آباد والا" کی ایک چٹ اس نے جواہر لال نہرو کے چپراسی کو دی۔

چپڑاسی نے کہا "پنڈت جی بھوجن کر رہے ہیں۔"

"اچھا جب بھوجن کر لیں تو دے دینا۔" یہ کہہ کر رضاکار اپنے کمرے میں چلا گیا۔

پنڈت نہرو برآمدے میں گھومنے لگا۔ ایک مرتبہ اس نے کھڑکی کے شیشوں سے اندر جھانکا۔ دیکھا کہ جواہر لال اپنی لمبی چوڑی میز پر بیٹھے ہوئے ایک ہاتھ سے روٹی کا نوالہ توڑ رہے ہیں اور دوسرے ہاتھ میں ٹیلیفون کا ریسیور تھامے ہوئے ہیں اور کسی سے گفتگو کر رہے ہیں۔ پنڈت نہرو نے اپنا چہرہ شیشوں پر ٹکا دیا۔ جواہر لال نے کھڑکی کی طرف غور سے دیکھا اور شیشے پر ٹکے ہوئے چہرے اور لمبی سفید ڈاڑھی کو

پہچانتے ہی وہ ٹیلیفون بند کرکے کرسیوں کو ہٹاتے ہوئے باہر آئے اور آتے ہی سلام کیے بغیر پنڈت نہرو سے لپٹ گئے۔ دونوں نے گیروے رنگ کے کھدر کے کرتے پہنے ہوئے تھے۔ پنڈت نہرو کا کرتا دو ماہ تک پرانے قلعہ کی خاک میں لوٹنے کی وجہ سے میلا ہو گیا تھا اور جواہر لال کا کرتا اُجلا تھا اور واسکٹ بھی اُجلی تھی، مگر دونوں کسی قسم کے اُجلے پن یا میلے پن کا خیال کیے بغیر دیر تک ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے دوستوں کی طرح لپٹے رہے۔ سینے سے سینہ ملا ہوا تھا، ایک کے سانسوں میں دوسرے کے سانس جذب ہو رہے تھے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ سسکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک صدی کے سارے غم بھلائے جا رہے تھے۔ زندگی بلند ہو رہی تھی۔ پنڈت نہرو نے اپنے مروڑیاں کھائے ہوئے سفید بالوں سے بھرے ہوئے نحیف ہاتھ سے جواہر لال کی کمر پر تھپکی دی۔ دوستی کا جذبہ پدرانہ شفقت کے نیچے دب گیا۔ جواہر لال نے الگ ہٹتے ہوئے کہا، "چاچا! آپ کہاں، میں تو سمجھا تھا کہ خدانخواستہ آپ . . . ."

پنڈت نہرو کے چہرے پر تبسّم مچلنے لگا۔ "نہیں، میں مرا نہیں ہوں،

شریف آباد پر حملہ تو ہوا تھا، لیکن ملٹری نے ہمیں بچا لیا ہے۔"

جواہر لال نے کہا: "چلئے اندر چلئے۔"

چپڑاسی چمکتا ہوا، سنہری حاشیے والا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

پنڈت نہرو نے کہا "میں صرف ایک شرط پر اندر چلنے کے لئے تیار ہوں۔ شرط نہیں، بلکہ آج تو ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔"

"فرمایئے۔ حکم کی تعمیل ہو گی۔"

"میں پاکستان نہیں جاؤں گا۔"

"تو نہ جایئے، آپ کو بھیجتا کون ہے۔"

"مگر میرے سارے بچے آج ہی پاکستان جا رہے ہیں۔ میں اُن کے بغیر بھی تو نہیں رہ سکتا۔"

جواہر لال کی ذہین آنکھیں مفلس کے چراغ کی طرح ٹمٹما کر رہ گئیں۔

"آپ اُنھیں بھی روک لیجئے۔ کچھ عرصہ وہ قلعہ ہی میں رہیں تو بہتر ہے۔ جب یہ آندھی اُتر جائے گی تو آپ کہیں گے تو شریف آباد ہی میں بسا دیں گے یا جہاں آپ چاہیں گے۔"

پنڈت نہرو نے اداسی سے کہا: "نہیں وہ کسی قیمت پر یہاں رہنے

کے لیئے تیار نہیں ہیں۔ اُنھیں پاکستان سے پاگلوں جیسی محبت ہے۔ کہتے ہیں، ہم جنت میں جا رہے ہیں، جنت میں۔ اور ہندوستان کو وہ جہنم کہتے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ اِسی جہنم سے پیار کرتا ہوں۔ مجھے پاکستان کے نام تک سے چڑ ہے۔ پنڈت جی، آپ خود ہی بتائیے میں اُس سرزمین کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں جس کی مٹی سے میری مٹی بنی ہے، جہاں میرے باپ دادا کی ہڈیاں دفن ہیں۔ آہ وہ قبرستان، وہ عیدگاہ، وہ عالمگیر مسجد۔ میں تصوّر تک نہیں کر سکتا کہ جیتے جی . . ."

جواہر لال نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا" نہ نہ، ایسی باتیں نہ سوچیئے میرا خیال ہے آپ اُن کے ساتھ پاکستان ہی چلے جائیں۔ ہم نے پاکستان کو دل و جان سے قبول کیا ہے۔"

پنڈت نہرو آگ بگولا ہو گیا۔ آنکھوں میں چنگاریاں سی چمکنے لگیں۔ "لیکن اُس دن آصف علی کے مکان پر تو آپ یہ کہہ رہے تھے کہ پاکستان کو مصلحتاً" تسلیم کیا گیا ہے۔ آخر یہ کیسے پینترے ہیں اور میرے ساتھ کیوں؟"

جواہر لال نے اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا" چاچا کیسی باتیں سوچنے لگے ہیں آپ۔ غصہ میں نہ آیئے۔ ذرا مستقبل پر نظر ڈالیئے۔ غور سے

سوچیئے۔ کیا پاکستان قائم بھی رہ سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔ میں کہتا ہوں کبھی نہیں، میں نے آپ سے اُس دن بھی کہا تھا کہ ہم نے محض انگریز کو نکالنے کے لئے یہ وقتی سمجھوتہ کر لیا ہے، کچھ عرصہ بعد ہم پاکستان والوں سے سمجھوتہ کر لیں گے۔ وہ ہمارے بغیر نہیں رہ سکتے اور ہم اُن کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آخر آپ یہ نکتہ سمجھتے کیوں نہیں ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھوتہ نہ کرتے۔ تو حالات ایسے پیدا کر دئے گئے تھے کہ ہم قیامت تک بھی آزادی حاصل نہ کر سکتے۔۔۔ بس اب غصّہ تھوک دیجئے۔ آپ اطمینان سے بچّوں کے ساتھ پاکستان چلے جائیے۔ وہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی اور اگر وہاں کوئی تکلیف ہو تو مجھے خط لکھ دیجئے، میں بذاتِ خود۔۔۔۔"

پنڈت نہرو نے آہ بھرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا "فرصت کے وقت وہ خود بھی جواب لکھیں گے۔۔۔ بہت خوب۔۔۔ مجھے سراسر دھوکا دیا گیا ہے۔ اُسے تو وزیرِ اعظم بننے کی پڑی ہوئی تھی۔ اپنی وزیرِ اعظمی کی خاطر یہ ذلیل پاکستان بھی مان لیا۔"

لاشعور کی تاریک گہرائیوں سے نکلا ہوا یہ لفظ "ذلیل" اُس کے سارے شکوک کو ایک ہی وار میں گھائل کر گیا، وہ شکوک جو ظہر کے وقت سے

یعنی جب سے کہ اُس نے پچھے کنوئیں کی مینڈھ پر بیٹھ کر خطوط چاک کیئے تھے۔ اُسے آہستہ آہستہ جواہر لال کے خلاف کرتے رہے تھے اور چپکے چپکے پاکستان کی طرف کھینچتے رہے تھے، آناً فاناً اوجھل ہو کر دل کے کسی ان جانے گوشے میں اس طرح روپوش ہو گئے جیسے کبھی پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔ شعور ایک مرتبہ پھر لاشعور کی پختہ عادت کی دبیز تہوں کے نیچے دب کر رہ گیا۔ پہلے روز اُس کے دماغ نے جس لکیر پر چلنا شروع کیا تھا، آج بھی اُسی لکیر پر چل رہا تھا۔ "مجھے کسی نے دھوکا نہیں دیا اور نہ میں کسی سے دھوکا کھا سکتا تھا . . . لیکن تُو نے جو اتنی قربانیاں دیں اُن سے کچھ حاصل بھی ہوا ہے؟" ترازو ہلنے لگی۔ ہاں اور نہیں کے دو الفاظ کے درمیان اُس کی رُوح پسنے لگی۔ دفعتاً ایک شعلہ سا لپکا اور اُسے راہ دکھا گیا۔ اُسے یاد آ گیا تھا کہ جواہر لال نہرو کی زندگی میں بھی ایک ایسا مقام آیا تھا، جب اُسے اس سوال کی خطرناکیوں سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ اس کا جواب دینے میں ذرا بھی نہ ہچکچائے تھے۔ پُرانی یادوں کی تلخیوں کو محسوس کرتے ہوئے اُنھوں نے اپنے آپ سے کہا تھا: "اگر مجھے اپنے موجودہ علم اور تجربے کے ساتھ گزری ہوئی زندگی پھر سے بسر کرنے کا موقع

ملے تو بے شک میں اپنی ذاتی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں کروں، مگر قومی معاملات میں میرے فیصلے وہی ہوں گے جو پہلے تھے۔" جواہر لال کے نقشِ قدم پہ چلنے کا عادی پنڈت نہرو یہاں بھی اُس کی پیروی کرنے سے باز نہ رہ سکا۔ اُس نے بھی اپنے آپ سے یہی کہا "میں نے جو کچھ کیا، وہ ٹھیک کیا۔" لیکن انسان کی فطری خود غرضی نے لپک کر اُس پہ ایک بھرپور وار کیا۔ "اور تیری قربانیوں کا صلہ؟ ایک نے مجھ سے کم قربانیاں دیں اور وزیرِ اعظم بن گیا۔ اور ایک میں ہوں کہ پانی کی ایک ایک بُوند کو ترستا ہوں۔"

وہ شخص جس نے ہمیشہ ذاتی اور قومی معاملات میں بے غرضانہ انداز میں سوچا اور سوچی ہوئی باتوں پہ جان کی بازی لگا کر عمل کیا، آج خود غرض بنا ہوا تھا۔ اُس نے چالیس کروڑ انسانوں کو (بقول جواہر لال بھارت ماتا کو) اپنی ذات میں یوں سمو لیا تھا کہ اُس کی ہر حرکت، ہر فعل اُنہی کے مفاد کی خاطر انجام پاتا تھا، لیکن آج خود غرضی اُس کی فطری عالمگیریت کو سمیٹ کر ایک چھوٹا سا دائرہ بنا رہی تھی۔ "میرے بچوں کا کیا بنے گا؟" دوسرے ہی لمحہ یہ دائرہ سمٹ کر ایک چھوٹا سا نقطہ بن گیا۔ "اور میرا

کیا بنے گا؟" وہ اپنے آپ کو اپنی ذات کے متعلق پہلی مرتبہ سوچتا ہوا دیکھ کر کچھ حیران تو ہوا۔ لیکن خواہشوں کا آسمان اُس کی روح پر چھا گیا۔ "تیرا کیا بنے گا جلال؟" سو سال کی عمر تک پہنچنے میں، پوری ایک صدی کو ٹھکا دینے کا فخر حاصل کرنے میں صرف دو ماہ، صرف ساٹھ دن باقی تھے اُسے یہ سوچنے اور خواہش کرنے کا پورا پورا حق تھا کہ ساٹھ دن اور وہ اس دُنیا میں زندہ رہ سکے۔ مگر ساٹھ دن اور زندہ رہنے کا طریقہ کیا ہے؟ اگر پانی اگلے دو چار گھنٹوں کے اندر اندر اُسے نہ ملا تو شاید وہ آج ہی سُورج کے غروب ہونے سے پہلے ڈُوب جائے گا۔

اب نہر کا پُل صرف چند گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ صبح آٹھ بجے سے چلتا چلتا وہ یہاں دو میل تک آگیا تھا۔ عرصۂ دراز کے بعد اُس نے اپنی ہڈیوں میں رُوح کے پُرانے ولولے محسوس کئے تھے۔ ماضی کی تمام خوشگوار و ناخوشگوار یادیں اُس کی کانپتی ہوئی ٹانگوں کو آگے ہی آگے چلنے کی ہمت بخشتی رہی تھیں۔ مگر ماضی کی بخشی ہوئی ہمّت نے صرف یہ کیا تھا کہ اُس کے غم کو دوبارہ زندہ کر دیا تھا اور اتنے شدید انداز میں کہ وہ اس سے پہلے کبھی اتنا غمگین و اُداس نہ ہُوا تھا۔ اس سے پہلے جب بھی

اُس کی ٹانگیں چلتی تھیں تو کسی ایسی سمت جسے وہ پہلے سے اپنی سوچ کا مقصد بنا لیتا تھا۔ نہر کے پُل تک تو وہ ماضی کے کندھے کا سہارا لے کر اور پانی کی خواہش کی انگلی پکڑ کر آ گیا تھا، مگر پُل کی اُونچی اونچی مٹی پر قدم رکھتے ہوئے اُس نے اپنے آپ سے پوچھا "تو یہاں کیوں آیا ہے جلال۔ یہاں کیا رکھا ہے!"

اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے وہ تھک گیا تھا۔ تھکا ہارا پکے سفید پُل کی مینڈھ پر آ بیٹھا۔ لاٹھی پُل کے ساتھ ہی لٹا دی۔ وہ صبح سے بھوکا پیاسا چلتا رہا تھا۔ کسی زمانے میں وہ اتنے وقت میں شریف آباد سے دہلی تک کا بائیس میل کا فاصلہ ہنسی خوشی طے کر لیا کرتا تھا اور آج وہ بڑی مشکل سے اس دو میل کے مختصر سفر کو طے کر سکا تھا۔ تھکن، آزردگی اور غم نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔ ایک ایک جوڑ اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر پُل پر لیٹ گیا۔

پُل سے تھوڑی دُور نہر کے اندر رتّہ کھتّہ کے چھوٹے چھوٹے بیسیوں ننھے بچے ہوا میں ریت اُچھال رہے تھے اور ہل کھل کر گا رہے تھے۔

پنڈت نہرو

ریت کے ذرّے

پانی کے چھینٹے

پانی کے چھینٹے

ریت کے ذرّے

ایک لوک گیت کے ابتدائی بولوں کی بُنیاد پڑ رہی تھی۔
عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ سُورج کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ تیزی سے مغرب کی کوکھ میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پنڈت نہرو کی بے نور آنکھیں کھیلتے گاتے ننگ دھڑنگ بچّوں پر جمی ہوئی تھیں۔ نہر میں لیٹی ہوئی موج در موج ریت پر بچّوں کے ہلتے ہوئے لمبے لمبے سائے ایک عجیب ہیولا سا بن گئے تھے۔ "اُف میرے پیارے بچّے۔ خدایا ان کا کیا بنے گا؟"
اُس کی آنکھیں اُوپر اُٹھیں۔ سامنے اُفق کے کنارے کنارے درختوں کے جھنڈ چُپ چاپ کھڑے تھے۔ آنکھیں ذرا اور جُنبش کر کے اُوپر آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ آسمان ہمیشہ کی طرح نیلا تھا۔ اگر یہ اسی طرح نیلا رہا اور اس پر ایک اور فصل تک کالی کالی بدلیاں نہ آئیں تو کیا ہوگا میرے مولا؟ کنوئیں سے گرے ہوئے کتّے کو باہر نکال بھی لیں اور اُس کے پانی کو پاک صاف کر بھی لیں تو

ایک کنواں پانچ چھ گاؤں کے انسانوں اور مویشیوں کے لیے کہاں تک پانی دیتا رہے گا - اور یہ لیٹی ہوئی بل کھاتی ہوئی نہر ؟ اس کی نگاہیں نہر کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگیں - یہاں ہیڈ سلیمانکی کے مقام پر یہ نہر ستلج سے نکل رہی ہے - نگاہیں بہتے ہوئے بھرے ہوئے ستلج کے ساتھ چلنے لگیں - دوآبے کے میدانوں میں سے ہوتی ہوئیں اوپر کوہ ہمالیہ کی چٹانوں اور وادیوں پر چڑھنے لگیں - چھوٹے چھوٹے ٹھنڈے پانی کے منتشر چشمے اسے اپنی طرف کھینچنے لگے لیکن اس کی نگاہیں برابر اسی ایک ندی کا تعاقب کرتی رہیں - ہوتے ہوتے وہ اس منبع تک جا پہنچا جہاں سے یہ ندی نکلتی تھی، جھیل مانسرور!

تو ستلج جھیل مانسرور سے نکلتا ہے، پہاڑوں سے گزرتا ہوا دوآبے کے میدان میں آتا ہے اور یہاں جگہ جگہ اس کے سینے سے چھوٹی چھوٹی رگیں نکلتی ہیں اور ایک پیچیدہ رگ بل کھاتی ہوئی اس پل تک پہنچ جاتی ہے جہاں میں لیٹا ہوا ہوں اور جہاں میرے نیچے دھوپ اور ریت کا کھیل کھیل رہے ہیں -

اگر کوئی اس رگ کو کاٹ دے یا اپنے آلات سے اس رگ کو پکڑ کر معدے کے کسی اور حصے میں لے جائے تو کیا ہو ؟ تو کیا واقعی یہ بستیاں

اُجاڑ ہو جائیں گی، یہ ہری بھری کھیتیاں ویران ہو جائیں گی ۔ ہو جائیں گی، تو ہو جائیں، ہمیں کیا۔ ہم ملتان چلے جائیں گے، سرگودھے چلے جائیں گے میں نے اُس وقت اپنی اولاد کی بات مان لی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ ٹھیک کہتے تھے کہ یہاں کی زمینیں اچھی نہیں ہیں، یہاں کنوئیں نہیں ہیں، بارش بھی نہیں ہوتی۔ میں تو کم بخت اس نہر پہ ریجھ گیا تھا۔ نہر نئی تھی، زمینیں نئی تھیں۔ پھر وہی 'نئی' اور 'نئیں'۔ تو بہ بتا اب کیا بنے گا؟ آسمان سے مینہ نہ برسا، زمین نے پانی نہ اگلا، نہر الگ سُوکھ گئی، پانی کہاں سے آئے گا؟ جلال! سوچ تو سہی، پانی آئے گا کہاں سے؟ — پانی پیو تو یاد کرو پیاس امام کی — یا خواجہ پانی! — یا مشکل کُشا پانی! — مگر پانی؟

بچے مٹھیاں بھر بھر کر ریت اُچھال رہے تھے:

ریت کے ذرّے
پانی کے چھینٹے
پانی کے چھینٹے
ریت کے ذرّے

بچے گیت گاتے ہوئے، کھیلتے ہوئے پل کی طرف بڑھ رہے تھے پیاس کی خواہش اچانک احتجاج کی صورت اختیار کر گئی۔ لوک گیت کے سُروں نے دم توڑ دیا اور ایک گونجتا ہوا نعرہ اُن کے ہونٹوں پر آگیا:

پنڈت نہرو۔ ہائے ہائے

یہی نعرہ لگاتے ہوئے وہ اور نزدیک آئے تو 'پنڈت نہرو' کے الفاظ پنڈت نہرو کے کان میں پڑے۔ اُس پر سناٹا چھا گیا۔ غور سے بچوں کی طرف دیکھا۔ محبت کی ایک بھرپور نگاہ نے سارے بچوں کو اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ "انھیں کون سمجھائے کہ پانی روکنے والا پنڈت نہرو میں نہیں ہوں، کوئی اور ہے جس کی صورت بھی انھوں نے نہیں دیکھی۔" جواہر لال کی صورت آنکھوں میں گھوم گئی، دل میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور بچوں کی طرف پیٹھ کر کے اور ہاتھوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔

بچے نعرے لگاتے ہوئے پل کے نیچے سے نکل کر دوسری طرف آ گئے اور پنڈت نہرو کے بالکل قریب کھڑے ہو کر ریت اچھالنے لگے۔ "پنڈت نہرو، ہائے ہائے۔" ایک ننگا بچہ ہجوم سے جدا ہو کر نہر کے اوپر چڑھنے لگا۔ یہ بچہ پنڈت نہرو کی نسل کا سب سے چھوٹا بچہ تھا۔

اُس کی عمر بمشکل پانچ سال کی ہوگی۔ نہر کی پٹڑی پہ دوڑتا ہُوا وہ پُل پہ آیا۔ اور پنڈت نہرو کے پاس آکر مچلنے لگا۔

پنڈت نہرو نے اُسے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی طرف کھینچا اور سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پُوچھا "کیا بات ہے بیٹے؟"

بچہ رونے لگا "اوں .... اوں.... اوں...."

"ارے روتا کیوں ہے پگلے؟"

بچے نے زیادہ زور سے روتے ہوئے اور ہونٹوں پر اپنے ننھے ہاتھ سے اوک بناتے ہوئے آہستہ سے کہا "پنلت جی، پیاچھ لگ لئی اے۔"

بہرے کانوں نے یہ دھیمی آواز سُن لی۔ بے نُور آنکھوں نے اُس اوک کا معصوم اشارہ دیکھ لیا۔ لیکن اُس نے پیار سے چمکارتے ہُوئے دوبارہ پُوچھا "کیا کہہ رہا ہے بیٹے؟"

بچے کی چیخیں نکل گئیں۔ ایک آنکھ سے ایک چھوٹا سا اُس کی عمر جتنا آنسو نکلا اور رُخسار پہ بہنے لگا۔ چیخ کر کہنے لگا "میں کہ لاآوں، مجھے پیاچھ لگ لئی اے۔ بڑے جول کی۔"

پنڈت نہرو اس چیخ کو چیرتا ہوا بچّے کے دل میں اُتر چکا تھا۔ "پیاس لگ لئی اسے میرے بیٹے کو۔ تیری ماں لاتی ہوگی پانی۔" پھر وہ بچّے کو اس طرح بہلانے لگا جس طرح جواہر لال نے اُسے بہلایا تھا۔ "ابھی گاؤں چلیں گے۔ وہاں تیری ماں پانی لائی ہوگی کنوئیں سے۔ میرا بیٹا بھی پیئے گا۔ میں بھی پیوں گا۔ مجھے بھی دے گا نا! کیوں بیٹا دے گا نا مجھے بھی۔"

لالچی بچّہ سہم کر چُپ ہو گیا۔ اُس کا ننّھا سا تخیّل ایک ہلکی سی پرواز کر کے رتنہ کھنہ کے اُس گھر میں چلا گیا، جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ صحن میں بیری کا ایک درخت ہے۔ درخت کے نیچے ایک گھڑونچی ہے۔ گھڑونچی پہ تین مٹکے ہیں۔ اُس کی ماں آرہی ہے۔ مٹکا انڈیل کر پانی گلاس میں نکال رہی ہے، غٹ غٹ۔ اور گلاس کا کنارہ ہونٹوں تک آگیا ہے اور آنکھیں پانی کو نزدیک آتا ہوا دیکھ رہی ہیں . . .

بچّہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ پنڈت نہرو نے اُسے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُٹھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ "پانی پیئے گا میرا بیٹا۔ میں ابھی اپنے بیٹے کو پانی دیتا ہوں۔ ابھی دیتا ہوں۔" دفعتہً ایک گھنگھور گھٹا دیکھتے دیکھتے سینے کے آسمان پہ چھا گئی۔ بادل گرجنے لگے، گڑ گڑ گڑ۔ بجلیاں

کوندنے لگیں۔ بچّے نے اپنے ننھّے ننھّے بازو دادا کی گردن میں حمائل کر دیئے۔ دادا نے بچّے کو زور سے چھاتی سے چمٹا لیا۔ "میں ابھی پانی دیتا ہوں۔" مینہ برسنے لگا، ٹپا ٹپ ٹپا ٹپ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں زور زور سے چلنے لگیں۔ دہکتی ہوئی آگ کے شعلے چھنن چھنن کر کے بُجھ گئے اور بل کھاتا ہوا دھواں دیر تک اُٹھتا رہا۔

پنڈت نہرو نے بچّے کو اپنے سینے سے جُدا کر کے اُس کے گال پہ اپنا گال رکھ دیا۔ پھر جوش میں آ کر اُسے ایک ہلکا سا بوسہ دیا۔ بوسے کے ساتھ ہی پانی کی چند بُوندیں، کہیں اُوپر سے آ کر اُس کے ہونٹوں کے کناروں پر ٹھہر گئیں۔ اُس نے خوش ہو کر اپنے آپ سے کہا۔ "ستلج تو میرے دل سے نکلتا ہے۔"

پنڈت نہرو نے زبان کی نوک سے بُوندیں چاٹتے ہوئے ایک بار پھر بچّے کو سینے سے لگا لیا اور اُسے اپنے ستلج سے سیراب کر دیا۔

تنقیدی جائزہ

ریاض احمد

[illegible]

[illegible]

پنڈت نہرو کو نہ آپ نے دیکھا ہے۔ نہ میں نے دیکھا ہے۔ لیکن ہم اسے دیکھ بھی کیسے سکتے تھے۔ اسے تو شریفہ آبا د والوں نے بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ اب رنہ کھنہّ والوں نے دیکھا ہے۔ وقت کے گزرتے ہوئے لمحوں کو سب دیکھتے ہیں۔ لیکن کبھی کسی نے یوں بھی کیا ہے کہ وقت کی باگیں روک لے، ماضی کو واپس لے آئے اور مستقبل کے بطن سے پیدا ہونے والے واقعات کے ہیولوں کو حکم دے کہ مجسم ہو جائیں، اور پھر حال کے بے نام لمحے کو یوں پھیلا دے کہ اس کی وسعت میں ماضی اور مستقبل دونوں، عمل اور ردِ عمل، علت اور معلول، غلط اندیشی اور پچھتاوا بن کر پہلو بہ پہلو کھڑے ہو جائیں — اس طرح کہ مستقبل چاہے تو ماضی کو مٹا ڈالے اور یوں خود بھی مٹ جائے۔ ردِ عمل کا نقش یوں دھیما ہونے لگے کہ عمل ایک خواب بن جائے، معلول ہوا میں

تحلیل ہو جائے تاکہ علت بھی باقی نہ رہے، پچھتاوے ایک پُرسکون آمیز طمانیت میں تبدیل ہو جائیں کہ غلط اندیشی یا غلط روی ہی باقی نہیں رہی۔ پنڈت نہرو ایک صدی کی روح کا پرتو ہے۔ اُس کی مثال اُس ہاتھی کی سی ہے جسے اندھوں کے ایک گروہ نے دیکھا تھا تو ہر ایک نے اُس کی تاویل اُس مختصر حصّے کے حوالے سے کی تھی جسے وہ ہاتھوں سے چھو سکے تھے۔ اب ایک دیدہ ور ان اندھوں کو کیا سمجھائے گا کہ ہاتھی نہ رسا ہے، نہ ڈھول، نہ چھاج نہ ستون۔ جس کسی نے پنڈت نہرو کو دیکھا تھا، اُس نے اُسے یا تو ریاکار مولوی سمجھا تھا یا فریب خوردہ مسلمان۔ کسی نے اس کو کارآمد کل پرزہ سمجھ کر سر آنکھوں پہ بٹھا لیا ہو گا۔ کوئی اس پہ طنز کر کے مسکرا لیا ہو گا۔ لیکن وہ طوفان جو پنڈت نہرو کے سینے میں مچل رہا تھا، وہ ابھی منتظر تھا۔ اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا، اسے رنہ کھنہ کی تپتی ہوئی دھرتی، سوکھی ہوئی نہر کے گرد آلودہ پل یا پھر اُس ننھی منّی سی جان نے دیکھا ہے جو اس کے سینے کے ستلج سے سیراب ہو کر بھی پیاسی ہی رہی۔ یہ ننھی سی جان ابھی اس قابل نہیں کہ اس طوفان کو ایک بے پناہ دھارے میں تبدیل کر کے اس کا رُخ اُن کی طرف موڑ دے جو اس کی سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں۔ یہ ننھی سی جان ابھی اس قابل نہیں کہ اس طوفان کو ایک

بے پناہ نفرت میں تبدیل کر سکے، جس کا ہدف خود اُس کی اپنی ذات نہ ہو۔ ایک ایسی نفرت میں جو ایک تعمیری قوّت بن سکتی ہے، جو اپنے لیے اتنی طاقت اور قوّت فراہم کر سکتی ہے کہ پھر کوئی اس کی بے بسی پر ہنس سکے نہ اس کی رُواداری سے کسی غلط بخشی کی اُمید رکھ سکے۔

یُوں پنڈت نہرو، کانگریسی مسلمانوں کا المیہ ہے اور اس لمحہ عرفان کی داستان ہے۔ جب خود ان مسلمانوں کی اپنی حیثیت ایک بڑا سا سوالیہ نشان بن کر ان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ نہ اپنے اٹھائے ہوئے قدموں کو واپس ہٹا سکتے تھے، نہ اپنوں کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتے تھے نہ اُن غیروں سے کوئی امید رکھ سکتے تھے۔ جن کے لیے اُنھوں نے اپنوں سے مُنہ موڑ لیا تھا۔ ان کے سامنے وہ سب ہو چکا تھا جو ایک فضائے برزم کی ننگی تلوار بن کر ان کے سروں پر ربع صدی سے لٹک رہا تھا جسے وہ جانتے ہوئے بھی ماننے سے انکار کر رہے تھے۔ پنڈت نہرو کا یہ رُوز صرف یہ کہہ سکتا تھا۔ "میں کیا بتاؤں گا بھئی۔ اکثریت نے جو فیصلہ کر دیا ہے۔ مجھے بھی تسلیم ہے۔ ویسے میرا دل نہیں مانتا۔" خود فریبی کا اس سے بڑا اقرار اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور اب اگر آپ چاہیں کہ میں فن کے پردے پر بنتے ہوئے حسین نقوش کو کسی اور طرح

پیش کروں تو یہ نہ صرف آپ کے ذوق کی توہین ہوگی بلکہ کچھ طبیعت بھی اکراہ کرے گی۔ ایک بات میں مان لیتا ہوں تو وہ میرے لئے بہت بڑی حقیقت بن جاتی ہے۔ لیکن آپ اسے نہیں مانتے تو میری منطق صرف آپ کے شکوک کو مضبوط کرتی رہتی ہے۔ فن کار کے پاس البتہ ایک ایسا حربہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کو قائل کئے بغیر اپنی بات کا نقش آپ کے ذہن پر چھوڑ جاتا ہے اور پھر کسی حقیقت شناس لمحے میں ضد اور خود پرستی کا حصار ٹوٹ جاتا ہے اور آپ کہہ اُٹھتے ہیں کہ سچ ہی تو کہتا تھا۔ پنڈت نہرو کا المیہ یہ ہے کہ اُس نے اپنی فطرت اپنی جبلت، اپنے مذہب، اپنے ایقان، اپنی معاشرت، اور ثقافت کے تقاضوں غرض اپنی ہر اُس چیز سے بغاوت کی، جو اس سے ایثار، محبت اور وفا کی طلبگار تھی اور یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ اُس نے غیروں سے جو پیمان وفا باندھا تھا اُس پر حرف نہ آنے پائے۔ اب ہمیں شاید یہ مان لینا چاہیئے کہ جتنی قربانیاں سیدھے سادے وفا پیشہ مسلمانوں نے کانگریس کے لئے دیں اتنی قربانیاں خود اُس اکثریت نے نہیں دیں جو آج تک ایک عظیم قوم بننے کی دعوے دار ہے۔ یہ وہی قوم ہے جو آج کانگریس کے حلیف مسلمانوں کی قوم کو اس جرم کی پاداش میں مٹا دینا چاہتی ہے کہ وہ اس کا آلہ کار بننے سے انکار کرتی ہے۔ ہم اس

بات، کو جانتے اور مانتے ہیں۔ لیکن بُرا ہو اس رواداری کا جو آج بھی ہمیں نفرت کرنے سے باز رکھتی ہے، جو آج بھی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ شریف دشمن کی طرح اپنی بلند اقدار کو اپنے ہاتھ سے نہ دو اور اس وقت کا انتظار کرو جب یہ بلند اقدار حریف کی کمینگی کو جیت لیں۔ پنڈت نہرو نے بالآخر اس امر کو محسوس کر لیا تھا کہ اس کی اپنی رُوحانیت ابھی کچّی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی دُعا سے بارش ہو سکتی تھی۔ گاندھی جی کے قدم جب دھرتی پہ آجائیں اُس دھرتی کے کنوئیں اپنے خشک سوتوں سے پانی کی لہریں اُچھال سکتے تھے لیکن وہ جو سیّد جلال الدین سے پنڈت نہرو بن چکا تھا۔ اس کی دُعائیں صرف اس کے آنسوؤں سے تر ہو سکتی تھیں۔ اس کی مدد کو نہ اس کا خواجہ پہنچا، نہ مشکل کشا، نہ شہیدِ کربلا۔ "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں"، والا قصہ دراصل خود فریبی ہی کی ایک شکل تھا۔ کیونکہ عارفوں کا قول اس ضمن میں یہ ہے ۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ارشادِ باری بھی بشرطِ استواری کے ذیل میں کچھ اس نوعیت کا ہے۔ "وَالَّذِینَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" کانگریسی مسلمان اس

حقیقت کو یقیناً فراموش کر چکے تھے کہ رواداری کی ایک حد ہوتی ہے اور حریف کے مقابل میں شدت اور اپنوں کے لیے سراپا رحم و کرم مسلمان کا شیوہ بھی ہونا چاہیے۔ پنڈت نہرو نے اس حقیقت کو معلوم تو کر لیا۔ لیکن اس وقت جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

لیکن شاید ابھی پانی سر سے نہیں گزر سکا۔ پنڈت نہرو کا المیہ اسی حقیقت کا علمبردار ہے کہ وہ رواداری جو ایک مدت تک ہم سے غیروں کو خراج وفا و محبت دلاتی رہی، اب اس کا رخ بدل جانا چاہیے۔ تقسیم ملک کے ہولناک واقعات پر اب تک جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اس کی نوعیت کچھ عجیب سی رہی ہے۔ کبھی تو انسانیت، کا نام لے کر تقسیم کے فلسفے کو جھٹلایا گیا۔ کبھی بہیمیت اور خونریزی کے طوفانوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر 'انسان' کو تلاش کیا گیا۔ کبھی جنسی تلذذ کی آڑ میں وہ گندگی اچھالی گئی کہ خدا کی پناہ۔ چھاتیوں کی قطع و برید، برہنہ جلوسوں اور ہوس پرستی کے افسانوں کو اس بہانے چھیڑا گیا کہ اس طرح ہمارے قومی جذبات کو ابھارنا مقصود تھا۔ لیکن اس حقیقت تک شائد کسی کے ذہن کی رسائی نہ ہوئی کہ اگر ہم اس نکتے کو پالیں جس نے ہمیں ان حالوں کو پہنچایا جس کا زہر اب بھی ہمارے رگ و پے سے زائل ہو جائے تو شائد ہم اپنے قومی

احساسات اور جذبات کو زیادہ پختہ بنیادوں پر استوار کر سکتے ہیں۔ پنڈت نہرو میں یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ پنڈت سے اپنی بقا اور سالمیت کی بھیک مانگنا غلط ہے۔ پنڈت نہرو سے یہ امید رکھنا کہ وہ ایک پاکستانی کی پیاس سے سوکھی ہوئی زبان کے نام پر ہندوستان سے جاری ہونے والی نہروں کے دہانے کھول دے گا آرزوئے خام ہے۔ پنڈت نہرو سے یہ امید رکھنا کہ کشمیر کے نہتے مظلوم مسلمانوں کو ان کا حقِ ارادیت بخش دے گا۔ اسی طرح ہے جس طرح پتھر کے سینے سے دودھ کا پھوٹ نکلنا۔ ہماری قومی تعمیر ہمارے وطن کی بقا، ہماری آئندہ خوشحالی کا ضامن وہ سوتا نہیں جو مانسرور سے پھوٹتا ہے، دیوتاؤں کی سرزمین سے بہ کر آتا ہے۔ ہمارے دریا، ہماری نہریں ہمارے کھیتوں کو سیراب کرنے والے پانی کے دھارے ہمارے اپنے سینے سے ہمارے اپنوں کی محبت کے تقاضوں سے جب تک نہ ابلیں گے اس وقت تک نہ ہمارے سینے کے زخم مندمل ہوں گے نہ ہمیں پچھتاووں کے بھوت چھوڑیں گے نہ ہمارے کھیتوں میں سبزہ لہرائے گا۔ "ریت کے ذرّے، پانی کے چھینٹے" ایک لوک گیت کے بول جبھی بن سکیں گے کہ ہم اپنوں کو برا کہنا چھوڑ دیں۔ آخر یہ کتنی بڑی حقیقت ہے کہ پنڈت جواہر لال ایک طرف تو یہ کہہ دے

کہ "ہم نے پاکستان کو دل و جان سے قبول کیا ہے۔" اور دوسری طرف ایک مخلص رضاکار کو یہ مشورہ دے کہ "آپ پاکستان چلے جائیے"۔ اور ہم آج بھی یہی سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ہمارے مسلمان رہنما جنھوں نے پاکستان کے قیام کے لیے جدوجہد کی تھی مخلص تھے یا محض انگریز کے پٹھو۔ . . .

پنڈت نہرو کا مواد ٹھوس تاریخی اور سیاسی حقائق ہیں۔ اس کے کردار ہماری گزشتہ صدی کی سیاسی جدوجہد کے جانے پہچانے کردار ہیں۔ ان کرداروں سے وابستہ ہمارے اپنے ردِّ عمل قدم قدم پر ٹھٹک کر ہمیں سوچنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہم ہر لمحے اُس سوال سے دوچار ہوتے ہیں جس سے پنڈت نہرو صرف ایک روز کانگریس کے دفتر میں کھڑے ہو کر کلمہ گویوں کے ساتھ ہاتھ کھڑے کرنے کے موقع پر دوچار ہوا تھا۔ عجیب بات ہے کہ پنڈت نہرو تو اس وقت ہاتھ کھڑا کرنے سے بالکل نہ ہچکچائے لیکن ہم آج تک ہچکچاتے رہیں۔ ہماری وفا کا مرکز اب ایک ہے۔ وہ ترغیب اور تحریص اب موجود نہیں ہے جس سے 'پنڈت نہرو' کو نبرد آزما ہونا پڑا۔ لیکن دلوں کے چور۔ . . . یعنی بے یقینیوں اور خود غرضیوں نے ہمارے مرکزِ وفا کو ہمارے سامنے آنے ہی کب دیا؟ یہ نازک نکتہ ہے 'پنڈت نہرو' کے مصنف نے اسے فن کے

آئینے میں جس طرح چاہا پیش کر دیا لیکن "بر ہنہ گفتن" کا موقع شاید ابھی نہیں آیا۔
مجھے اجازت دیجئے کہ میں جواہر لال نہرو کے صرف، یہ الفاظ دہرا دوں :

"کیا پاکستان قائم بھی رہ سکتا ہے؟ — آخر آپ یہ نکتہ سمجھتے کیوں نہیں۔"
اس میں چاپلوسی سہی، سیاسی عیاری سہی، کھسیانی بلّی کا کھمبا نوچنے والا انداز سہی، لیکن اپنے سینے ٹٹولیے اور یہ کہہ دیجئے کہ سوچ کا یہ انداز ہماری رگوں میں زہر نہیں گھول رہا، وہ سُن کر دینے والا زہر، جو ایک بے حسی بن کر ہمارے شعور اور اعصاب دونوں کو شل کر دیتا ہے۔ یہ بات میں بار بار اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تقسیم یا فسادات کا موضوع ہمارے ہاں جس طرح آیا ہے اس نے ہمیں اگر کہیں جھنجھلاہٹ بخشی ہے تو اس کے ہدف ہ اپنے تھے، اگر کبھی تسکین بخشی ہے تو اس صورت میں کہ ہم عینیت پرستی کے بے عمل فلسفوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی بھی کہ اپنی قومیت کا شعور پوری شدّت اور پوری تندی کے ساتھ (خواہ اس میں کتنی ہی تلخی کیوں نہ آجاتی) ہمارے ذہن پر مسلط کر دیا جاتا۔ نہرو، گاندھی آزاد، حتیٰ کہ پٹیل کی صلاحیتوں کے اعتراف میں ہم جتنی رواداری اور وسیع المشربی کا ثبوت دے سکتے ہیں کیا ہم اس کا ایک شمہ بھی قائدِ اعظم، قائدِ ملت، یا کسی دوسرے مسلم لیگی رہنما کے لئے محبت اور عقیدت کے جذبات نذر نہیں کر سکتے؟

مجھے احساس ہو چلا ہے کہ میں اس نکتے پر اب اس حد تک اصرار کر چکا ہوں کہ اسے اب یہیں ختم کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

جہاں تک 'پنڈت نہرو' کے فنی محاسن کا تعلق ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ اسے ناولٹ کہیں گے، طویل مختصر افسانہ کہیں گے یا صرف افسانہ۔ یہ طویل ضرور ہے۔ لیکن اس میں پلاٹ کچھ ایسا گٹھا ہوا ہے۔ واقعات کچھ اس طرح باہم پیوست ہیں کہ کہیں تقسیم یا وقفے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سید قاسم محمود نے تکنیک کچھ ایسی اختیار کی ہے کہ کہیں انھوں نے وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ واقعات کا تعاقب کیا ہے، کہیں انھوں نے پلٹ کر ماضی کے کسی لمحے کو حال میں زندہ کر دکھایا ہے اور کہیں آنے والے واقعات کو سامنے سے جا پکڑا ہے۔ وقت کا تصور یوں بھی افسانوی فن میں ایک عجیب مسئلہ بن جاتا ہے لیکن اس افسانے میں تو یوں ہوا ہے کہ ایک صدی ایک دن کے چند مختصر لمحوں میں مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جو کچھ ہوا، ابھی آپ اس کی جھلک دیکھ رہے تھے اور ابھی آپ ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ وہ لمحہ حال کا لمحہ تھا اور وہ ماحول آپ کے چاروں طرف پھیلے ہوئے واقعات سے نبرد آزما۔ کہیں ۱۹۳۷ء ہے کہیں ۱۹۴۷ء۔ لیکن اصل میں نہ

۱۸۵۷ء ہے نہ ۱۹۲۲ء، نہ ۱۹۳۷ نہ ۱۹۴۲ نہ ۱۹۴۷ء وہ تو آج کا
دن ہے جس میں ایک صدی کا عکس یُوں پڑ رہا ہے جیسے پانی کے ایک چھوٹے
سے لگن میں پُورے آسمان کا عکس ہو۔ اس ایک آج کی محدودیت میں پوری
صدی کا اطناب کھنچ آیا ہے۔ عرفِ عام میں اسے فلیش بیک کی تکنیک کا
نام دے سکتے ہیں۔ دوسری اصطلاحوں کے سلسلے میں مشکل یہ ہے کہ ان سے
کسی کیفیت کا نام تو دیا جا سکتا ہے لیکن اس کی معنویت اور انفرادیت کو نہیں
سمجھایا جا سکتا۔ پنڈت نہرو میں خوبی کی بات یہ ہے کہ اس کا احاطۂ عمل
بہت وسیع ہے۔ غالباً وقت کا اتنا وسیع کنویس ایک پورے ناول کا
موضوع ہونا چاہئے تھا جسے مصنف نے ایک کردار کے وسیلے سے ایک
افسانے میں سمیٹ لیا ہے اور اسی طرح یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس
افسانے میں بے شمار کردار آ گئے ہیں۔ تاریخی شخصیتیں بھی ہیں، بے نام
شخصیتیں بھی ہیں۔ وہ بھی ہیں جنھوں نے بقول پنڈت نہرو زیادہ صعوبتیں
اُٹھائیں، زیادہ قربانیاں دیں، لیکن اپنے حالات کسی کتاب میں نہیں لکھے جو
مشہور نہ ہوئے۔ دوسری طرف وہ بھی ہیں جنھیں سب لوگ جانتے ہیں لیکن
اصل میں یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ تو صرف وہ پرچھائیاں ہیں جنھیں ہم صرف ایک

کردار پنڈت نہرو کے آئینے میں دیکھتے ہیں اور خود پنڈت نہرو کو نہ آپ نے دیکھا ہے نہ میں نے دیکھا ہے۔ نہ شریفہ آباد والوں نے نہ رتنہ کھنّہ والوں نے۔ نقہ نقاد شاید اسے یوں کہیں گے کہ پنڈت نہرو تو ایک مثالی کردار ہے۔ ورنہ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔ ایک صدی کا بوجھ اپنے شانوں پر اُٹھا کر، یتیمی، لکڑہارے کے پیشے، مسجد کی امامت، کانگریس کمیٹی کی رُکنیت اور صدارت سے رتنہ کھنّہ کی ایک گمنام جھونپڑی میں اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہنے تک کا فاصلہ کون طے کر سکتا ہے؟ لیکن یہ فاصلہ ان ۱۵۳ صفحات میں پنڈت نہرو نے طے کیا ہے، اس طرح طے کیا ہے کہ صدیوں اور سالوں کا اطناب گھنٹوں اور لمحوں میں کھنچ آیا ہے۔ ہماری جدوجہد آزادی کی بعض تصویریں جن سے ابھی وہ پود، جو اب بوڑھی ہو چلی ہے بخوبی آشنا ہے، پوری تابانی کے ساتھ ان صفحات پر روشن ہیں۔ کچھ عرصہ گزر جانے پر یہ چیزیں تاریخ کے طالب علم کے لئے تو زندہ رہیں گی لیکن عوام کے لئے ان کا احساس ناممکن ہو جائے گا۔ اس اعتبار سے 'پنڈت نہرو' کی حیثیت ایک طرح کی دستاویز کی ہے۔

ایک کردار اور کہانی کے مربوط پلاٹ سے یہ بات تو ظاہر ہوتی ہے کہ مصنف کی توجہ کا ارتکاز اپنے مرکزی نکتے سے نہیں بھٹکا، لیکن یہی ارتکاز ایک قسم کی اکتاہٹ اور یک رنگی بھی پیدا کر سکتا تھا۔ اس کے لئے سیّد قاسم محمود نے ایک تو پنڈت نہرو کے دہرے کردار سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک پنڈت نہرو وہ ہے جسے افسانے میں ہر جگہ جواہر لال کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کردار کی سیماب صفتی اور پُر جوش بچپنا اُس پنڈت نہرو کے مقابلے میں جو کبھی سیّد حافظ جلال الدین تھا، ایک عجیب تضاد کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہی پُر جوش جواہر لال ایک طرف شریف آباد والے جلسے میں مولوی جلال کے گلے میں ہار ڈال دیتا ہے، بھارت ماتا کو چالیس کروڑ انسانوں سے تعبیر کرتا ہے اور یہی جواہر لال چند سال بعد مولوی جلال الدین کو سمجھانے لگتا ہے "چاچا جی اس کے بغیر چارہ نہیں تھا ہمارے لئے . . . فی الحال ہم نے پاکستان کو تسلیم کیا ہے۔ جب ہماری حکومت قائم ہو جائے گی، تو بعد میں دیکھا جائے گا . . . کبھی بھارت ماتا کے بھی ٹکڑے ہو سکتے ہیں . . . کچھ عرصہ بعد ہم پاکستان والوں سے سمجھوتہ کریں گے وہ ہمارے بغیر نہیں رہ سکتے ہم ان کے بغیر نہیں رہ سکتے . . . . بس آپ غصہ تھوک دیجئے۔ آپ بچوں کے

ساتھ پاکستان چلے جائیے۔ وہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی اور اگر وہاں کوئی تکلیف ہو تو مجھے خط لکھ دیجئے۔" بوکھلاہٹ کی تضاد بیانی دلچسپ ضرور ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں سیدھا سادا مولوی جلال الدین ہے جسے یہ ہیر پھیر کبھی نہ آیا۔ اُس نے وہ وقت بھی دیکھا تھا۔ جب جواہر لال کی طراری انگریز کی ایک گھرکی پر عدم تشدد کا سہارا لینے پر اُتر آئی تھی اور اُس نے سب پر تھوکنے کے بجائے فوراً یہ کہہ ڈالا تھا کہ "آپ اس غریب بڈھے کو کیوں مارتے ہیں۔ اس کی جگہ آپ مجھے ماریں۔" مولوی جلال الدین کوڑے کھاتا رہا لیکن جان بچانے کے لئے کوئی جواز نہ ڈھونڈ سکا۔ جب اُسے بڑی دیر کے بعد جاکر حقیقت سمجھ میں آئی تو پھر بھی اپنے مسلک سے نہ ہٹا۔ اُس نے جواہر لال کو صرف طعنہ دیا کہ "اسے تو وزیر اعظم بننے کی پڑی ہوئی تھی۔" لیکن یہ کہنے سے باز نہ رہ سکا۔ "اپنی وزیر اعظمی کی خاطر یہ ذلیل پاکستان بھی مان لیا۔" اس تقابلی طنز کا وار اُس منظر میں بھی بڑا ابھرپور ہے جہاں کانگریسی زعماء نشر تقریر کے مسودے کو آخری شکل دے رہے ہیں اور پنڈت نہرو اور اس کا بُرو ز۔ بیٹھے ہوئے سر پیٹ رہے ہیں کہ "دل نہیں مانتا۔" کردار نگاری ہی کے سلسلے میں ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے۔ یوں تو اس افسانے میں صرف

ایک کردار ہے۔ جس کا تاثر ظاہر ہے کہ بڑا بھرپور ہے لیکن بعض جگہ چھوٹے چھوٹے ہلکے ہلکے اشاروں میں بعض ذیلی کردار بھی بڑی خوبی سے اُجاگر ہو گئے ہیں۔ بھوپ سنگھ کو تو چھوڑ دیجئے کہ اس نے ایسا کارنامہ سرانجام دیا کہ کون مائی کا لال اس کا مقابلہ کرے گا، لیکن شریف آباد کی مسجد میں سدا متبسّم چہرے والا نوجوان مقرر، جیل میں ورزش کرنے والا اور کپڑے دھونے والا کسرتی بدن کا جوان، قیدیوں کا استاد، شریف آباد کے میر حشمت علی۔ بھومن بنجارہ، منشی شجاعت علی، میر ہاشم علی اپنی ایک آدھ جھلک بھی کچھ اس طرح دکھاتے ہیں کہ اُن کا نقش ذہن پر مرتسم ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسلوب اور اندازِ بیان کی بات تو رہی جاتی ہے۔ سیّد قاسم محمود سیدھی بات کہنے کے عادی ہیں۔ اس افسانے میں بھی اُنھوں نے زبان و بیان کا کوئی ایسا اسلوب اختیار نہیں کیا جو مکلّف یا آراستہ ہو۔ اُن کی نثر رواں دواں بیانیہ رنگ کی حامل ہوتی ہے۔ وہ رومان پسندوں کے برعکس جذباتیت سے لبریز استعارات اور اسمائے صفات کی لمبی لمبی فہرستوں سے ہمیشہ گریز کرتے رہے ہیں۔ اُن کا یہ انداز اس افسانے میں بھی قائم ہے اور یہی اس کی خوبی ہے اُنھوں نے رومانیت یا سستی جذباتیت کو اپنے بیان میں کہیں در نہیں آنے دیا۔

نہ واقعات اور نتائج کے ایسے سلسلے مرتب کئے ہیں جن کی دلچسپی محض اُن کی جذباتیت سے وابستہ ہو۔ جہاں کہیں ایسے مواقع آئے ہیں، وہاں اُنھوں نے ایک سنگدل انسان کی طرح اُلٹا طنزیہ رنگ اختیار کر لیا ہے یا بیانِ محض پر اکتفا کی ہے۔ مثلاً جیل میں پنڈت نہرو کی حبارت یا شریف آباد کے پنڈال میں مولوی جلال کے لیئے پنڈت نہرو کا کرسیٔ صدارت پیش کرنا یا آخر میں جہاں پنڈت نہرو اپنی نسل کے سب سے چھوٹے فرد کو جذبات سے مغلوب ہو کر لپٹا لیتا ہے۔ اس افسانے کا ایک سیدھا سادا رومانی حل یہ تھا کہ عین اُس وقت جب بچے نے توتلی زبان میں پیاس کی شکایت کی تھی تو دُور سے نہر میں پانی آتا ہوا نظر آنے لگتا اور پانی کی لہریں اُچھلنے لگتیں یا جب پنڈت نہرو نے تنہا نمازِ استسقا پڑھی تھی تو سچ مچ کی گھٹائیں برس پڑتیں۔ لیکن یہ کٹھور انسان ایسی رومانی نزاکتیں کیا جانے۔ اس کے سامنے تو صرف سنگلاخ حقیقتیں ہی باریاب ہو سکتی ہیں۔ بارش کو نہ برسنا تھا نہ برسی۔ نہر میں پانی کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ نمازِ استسقا کے سلسلے میں غالباً ہم یہ سبق اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ بھی اس وقت قبول ہوتی ہے جب اجتماع کے ساتھ ادا کی جائے۔ اجتماع سے کٹ کر دُعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ کانگرسی مسلمان کا المیہ

بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ بھی اجتماع سے کٹا ہوا تھا۔ افسانے کا انجام نہایت فن کارانہ مہارت سے کیا گیا ہے۔ اس انجام کی وجہ سے یہی نہیں کہ کردار میں تضاد پیدا نہیں ہوا، بلکہ وہ زیادہ بلند اور قابلِ محبت ہو گیا ہے۔ اگر کہیں بارش ہو جاتی یا نہر میں پانی آجاتا تو کردار کا وہ ارتقاء جو افسانے میں لحظہ بہ لحظہ اُجاگر ہو رہا تھا، بُری طرح مجروح ہوتا۔ اگر پنڈت نہرو عرفان کی اِن آخری حدوں کو نہ چھوتا تو اُس کا کردار مکمل ہوتا نہ ہم شاید اپنے ذہنی چوروں سے نجات پا سکتے۔

اور اب آخر میں اگر آپ اجازت دیں تو 'پنڈت نہرو' کے مصنف کے متعلق بھی کچھ عرض کروں۔ سیّد قاسم محمود، چند سال ادھر حلقۂ اربابِ ذوق میں آئے۔ دبلے پتلے، سانولی رنگت، نقوش خاصے تیکھے، کچھ ڈھونڈتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، آواز میں ایک کھنک اور لہجے میں ایک قدرتی ڈرامائی انداز۔ لوگ اُن کے بے پناہ خلوص اور جانفشانی کے بہت جلد معترف ہو گئے۔ اُنھوں نے اپنا افسانہ "میرا عاشق" پڑھا تو خوب داد ملی۔ اسی افسانے پہ حلقے کے جائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے اور اپنے فرائض بڑی تن دہی اور ذمہ داری سے انجام دیئے۔ اس کے بعد تین چار برسوں ہی میں اُن کی

متعدد تصانیف شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ ایک کامیاب مترجم کی حیثیت سے تو وہ خاصے متعارف ہو چکے ہیں۔ اس ذہین اور حساس نوجوان کو خدا نے قلم کی وہ روانی عطا کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس مختصر سے عرصے میں معاشی اور تعلیمی مصروفیات کے باوجود اُنھوں نے اتنا کچھ کس طرح لکھ لیا ہے اور یہ سُن کر تو میں ششدر رہ گیا کہ "پنڈت نہرو" اُن کی صرف ایک نشست کا کرشمہ ہے۔ اُن کا خلوص، تخلیقی لگن اور علم و فن سے محبت یقیناً اس امر کے ضامن ہیں کہ اُن کے قلم سے جو تصانیف نکلیں گی وہ معیار اور مقبولیت کی اُس سطح کو چھو لیں گی جو ایک اچھے فن کار کا واحد صلہ ہوتی ہے اور "پنڈت نہرو" اس پر گواہ ہے۔

سیّد قاسم محمود

ولادت	۱۷ر دسمبر ۱۹۳۱ء
تعلیم	متعلم ایم اے
مشاغل	مدیر دو ماہی "صحیفہ"

★

تصانیف

معاشیات کے جدید نظریے
آسان معاشیات
معاشیاتِ پاکستان
دیوار پتھر کی (افسانوں کا مجموعہ)
قاسم کی مہندی (") زیرِ طبع
سائنس کیا ہے ؟
جنسی رسومات
پنڈت نہرو (ناول)
عمرِ رواں (") زیرِ طبع
چھمک چھمکا چھمک (") "

★

تراجم

ایک دل (موپاساں)
جواری (دوستوفسکی)
ہوائی جنکشن (جان ماسٹرز)
علم کے نئے اُفق (سی ای ایم جوڈ)
میکبتھ (ولیم شکسپیئر)
رُوپ سروپ (ارونگ سٹون)
انصاف (گالزوردی)
کلاسیک کیا ہے؟ (ٹی ایس ایلیٹ)
عشقِ بلاخیز (ایملی برونٹی) — زیرِ طبع